مرزا داغ دہلوی کی شاعری

سیّد محمّد فاروق

اردو رائٹرس گلڈ، الہ آباد

مرزا داغ دہلوی کی شاعری

سید محمد فاروق

لٹریری بک سنٹر۔ الہ آباد

ڈاکٹر سید اعجاز حسین اور
ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی کی یاد میں

کتاب کا نام : مرزا داغ دہلوی کی شاعری
مصنف : سید محمد فاروق
کتابت : منشی محمد نذیر انصاری
طباعت : اسرار کریمی پریس، الہ آباد
اشاعت : ۱۹۹۶ء
تعداد : ۵۰۰
قیمت : ۱۱۵ روپے
ناشر : اردو رائٹرس گلڈ، ایل۔ آئی۔ جی۔ ۱۰
نیم سرائے۔ اے ڈی اے۔ کالونی
منڈیرا چک۔ الہ آباد ۲۱۱۰۱۱
تقسیم کار : لٹریری بک سنٹر۔ ۱۲۶ چک، الہ آباد

پیش لفظ

سیّد محمد فاروق صاحب کا یہ مقالہ اپنے
وقیع مواد کی وجہ آج بھی وہی قدر و قیمت
رکھتا ہے۔ یہ مقالہ ۴۰ سال قبل شائع ہوا
تھا جسے نئی ترتیب و تہذیب کے ساتھ دوبارہ
شائع کرنے کا فخر لٹریری بک سنٹر الہ آباد کو
حاصل ہوا ہے۔

توقع ہے کہ یہ مقالہ طلبا اور عام شائقینِ
ادب کے لیے استفادہ کا باعث ہوگا۔

ساحل احمد

نواب مرزا خاں داغ اُن مقدس اور قابلِ پرستش نفوس کی آخری یادگار تھے جو اپنے کمال کے زور سے دہلی کے اُفق سے طلوع ہو کر آسمانِ سخن پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے اور خاک دانِ ہند کو اپنی نورانی فکر کی شعاعوں سے منور کیا۔ پروفیسر آزاد مرحوم نے صفحاتِ آبِ حیات میں بہارستانِ اُردو کی جو نشاط انگیز تصویر دکھائی ہے وہ پانچویں دَور پر آکر ختم ہو گئی ہے لیکن اگر زمانہ مساعدت کرتا اور وہ اپنے تذکرے کی تکمیل پر قادر ہوتے تو ایک یہ یقینی امر ہے کہ اس دَورِ آخر کے شعرا میں داغ کا ذکر نہایت جلی الفاظ میں کیا جاتا اور رشہ نشین شاعری پر جو جگہ ذوق نے خالی کی تھی بلاشبہ داغ کے حصہ میں آتی۔

اُردو شاعری کی کوئی مبسوط تاریخ موجود نہیں لیکن جو کچھ بھی معلومات مولانا آزاد کے رشحاتِ قلم کی صورت میں ہم تک پہنچی ہے اُس پر سرسری غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سلف سے لے کر خلف تک کئی نوع کے شعر گو ہمارے اُردو ادب میں موجود ہیں مگر مجموعی طور پر داغ کا سا جامع خصوصیات شاعر اُردو شاعری میں نہیں گذرا۔ یہ خصوصیات کچھ تو ان کے کلام اور کمال سے متعلق ہیں اور کچھ ان کی ذات سے، اور ان

سبھوں نے مل کر اُن کی شخصیت کو یقیناً ایک قابلِ رشک چیز بنا دیا تھا۔

حضرت داغ ۲۵ رمئی ۱۸۳۱ء (مطابق ۱۲ ذی الحجہ ۱۲۴۶ھ) کو بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ اس زمانہ میں شعر و شاعری کا جو چرچا وہاں تھا اُس کے دلچسپ تذکروں سے باخبر اصحاب ناواقف نہ ہوں گے۔ بادشاہ و ولیعہد دونوں شعر گوئی کے دلدادہ تھے اور حکمرانوں کے اس شوق نے امرا اور متوسطین کے طبقے میں بھی شاعری کی روح پھونک دی تھی۔ داغ بھی سن تمیز کو پہنچتے ہی اسی دیوی کے پرستاروں میں شریک ہو گئے لیکن خون لگا کر شہیدوں میں نہیں ملے۔ مبداء فیاض سے اُنہیں وجدان سلیم کا وافی حصہ ملا تھا اور فطرت نے اُنہیں ذہین، نکتہ رس اور طبّاع بنانے میں بخل سے مطلق کام نہ لیا تھا۔ ممکن نہیں کہ انسان جس آب و ہوا میں پلے اُس سے دل و دماغ متاثر ہوئے بغیر رہیں، خصوصاً اس صورت میں کہ جذب تاثیر کی قوت بھی درمیان میں کام کرتی ہو۔ اُس زمانہ میں قلعہ معلّٰی میں شاہی اہتمام سے مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ مخصوص اشخاص کو شرکت کی اجازت ملتی تھی۔ بادشاہ خود تشریف لاتے تھے۔ اساتذہ وقت کے علاوہ دوسرے مشہور شعرا کو بھی باریابی کا موقع ملتا تھا۔ جب کسی امیر و رئیس کے صاحبزادے بہ حیثیت شاعر اس جلسے میں آتے تو سب سے پہلے بادشاہ سلامت کے سامنے پیش ہوتے اور پھر وہ اپنا کلام سُناتے۔ اسی حیثیت اور اسی صورت سے ہم داغ کو بھی بہ عالم نوعمری بادشاہ کے سامنے یہ غزل سُناتے دیکھتے ہیں۔

نکال اب تیر سینے سے کہ جانِ پُر الم نکلے
جو یہ نکلے تو دل نکلے تو دم نکلے

مرے دل سے کوئی پوچھے شبِ فرقت کی بے تابی
یہی فریاد تھی لب پر کہ یارب جلد دم نکلے

ہوئے مغرور وہ جب آہ میری بے اثر دیکھی
کسی کا اس طرح یارب نہ دنیا میں بھرم نکلے

مبارک ہو یہ گھر غیروں کو، تم کو، پاسبانوں کو
ہمارا کیا اجارا ہے، نکالا تم نے، ہم نکلے

سمجھ کر رحم دل تم کو دیا تھا ہم نے دل اپنا
مگر تم تو بلا نکلے، غضب نکلے، ستم نکلے

دمِ پرسش جو دیکھا اُس بتِ سفاک کو مضطر
صفِ محشر سے دل پکڑے ہوئے گھبرا کے ہم نکلے

کہیں کیا دل میں کیا آیا، کہیں کیا منہ سے کیا نکلا
کبھی جو چلتے پھرتے ہم سوئے بیت الصنم نکلے

گئے ہیں رنج و غم اے داغ بعد مرگ ساتھ اپنے
اگر نکلے تو یہ اپنے رفیقانِ عدم نکلے

یہ غزل بادشاہ سلامت کے طرحی مصرعہ پر کہی گئی تھی۔ کسی شاعر کی ابتدائی کوششیں اس سے زیادہ بار آور نہیں ہو سکتیں کہ سامعین سے قبولیت اور پسندیدگی کا سرٹیفکیٹ لے لیں۔ داغ کا ایک ایک شعر اہلِ مجلس کو لطف بخش رہا تھا اور جب غزل تمام ہوئی تو بادشاہ بے ساختہ کہہ اُٹھے کہ "کیا اچھی طبیعت پائی ہے۔"

لیکن یہ پہلا ہی موقع نہ تھا کہ داغؔ مشاعرے میں آئے ہوں۔ شاہی مجلس شعر و سخن کے علاوہ دہلی میں اُس وقت عام طور پر مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ اور اُن میں داغؔ اس سے کچھ بیشتر اپنی نازک خیالی کا ثبوت خاص و عام کے سامنے پیش کر چکے تھے۔ شاہی مشاعرے میں اُنھیں جو کامیابی ہوئی اُس نے اُن کے طائرِ شہرت کے پر لگا دیئے اور اُس کے بعد پھر کوئی مشاعرہ ایسا نہ ہوتا تھا جس میں مشتاقانِ فن کی نگاہ داغؔ پر خصوصیت سے نہ پڑتی ہو۔

مرزا داغؔ کے کلام نے قبولیت کے وہ تمام مدارج طے کر لیے ہیں جو برسوں میں بھی معمولی شعرا کے لئے بہت دشوار بلکہ ناممکن ہوتے ہیں۔ قاعدے کی بات ہے کہ اُستاد کی زندگی تک شاگرد کی نام آوری کا حلقہ بہت محدود رہتا ہے۔ اس کلیہ کا استثنا کچھ تو داغؔ کے اُستاد ذوقؔ کے حالات میں پایا جاتا ہے جنھوں نے شاہ نصیر کی موجودگی ہی میں غیر معمولی ہر دلعزیزی پیدا کر لی تھی اور کچھ داغؔ کی سرگذشت میں کہ اُنھوں نے اپنے اُستاد کے سامنے اپنا نام چمکا لیا۔ ذوقؔ کی کامیابی کا راز شاہی سرپرستی میں چھپا ہوا ہے۔ لیکن داغؔ محض اپنے کلام کے زور سے مشہور ہوئے۔ غرض داغؔ کا ابتدائی رنگ اس قدر شوخ تھا کہ ہر کس و ناکس کی نگاہ اُس پر پڑتی تھی اور اُس کے ساتھ تاثیرِ کلام نے مل کر سونے میں سہاگے کا کام کیا کہ جن مشاعروں میں غالبؔ، ذوقؔ، شیفتہؔ، نیرؔ وغیرہ معرکہ آرائیاں کرتے تھے وہاں داغؔ بھی اپنے کمال کے زور سے خراجِ تحسین حاصل کرنے میں کبھی ناکام نہیں رہے۔

داغؔ شیخ ابراہیم ذوقؔ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ یقیناً ذوقؔ کو ایسے سرمایۂ ناز شاگرد کے وجود پر فخر رہا ہوگا لیکن ان دونوں کی پرائیویٹ زندگی اور

ذاتی روابط کے وہ نقش و نگار معدوم ہیں جو غالب کے "اُردوئے معلّیٰ" میں کھینچے گئے ہیں اور جن سے اُستاد اور شاگرد کے ارتباط و خلوص کی صحیح اور سچی کیفیت پیشِ نظر ہو جاتی ہے۔ مولٰینا آزاد نے ذوق مرحوم کے حالات میں اُن کی زندگی کے ہر پہلو پر ضرورت سے زیادہ روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے لیکن ان کے شاگردوں کا معمولی سا تذکرہ بھی نہیں کیا گیا اور نہ اُس سے بہت سے ادبی فوائد مترتب ہو سکتے تھے۔ بہرکیف ذوق کے شاگرد ہونے کا فخر خواہ داغ کے لئے ذاتی طور پر مایۂ نازش رہا ہو لیکن اُن کی عظمت کی شہرت کی کفالت ان تعلقات سے نہیں بلکہ اُن کے کلام سے ہے۔ اُستاد کے فیضان سے مستفیض تو ہوئے ہوں گے۔ لیکن داغ کی ناموری اور اقبال مندی اُن کی ذہنی اور دماغی خصوصیات سے ہے اور اس لئے ہر دل عزیزی اور قبولیت عامہ کا تمام کریڈٹ خود اُن کی ذات کو ملنا چاہیے مولٰینا حالی فرماتے ہیں اور کس قدر صحیح فرماتے ہیں کہ

> ہمارے ملک میں جو شاعری کے لیے ایک اُستاد قرار دینے کا دستور اور اصلاح کے لیے ہمیشہ اُس کو اپنا کلام دکھانے کا قاعدہ قدیم سے چلا آتا ہے اس سے شاگردوں کے حق میں کوئی معتدبہ فائدہ مترتب ہونے کی اُمید نہیں ہے۔ اُستاد شاگرد کے کلام میں اس سے زیادہ اور کیا کر سکتا ہے کہ کوئی گرمر کی غلطی بتا دے یا کسی عروضی یا لغزی کی اصلاح کر دے لیکن اس سے نفسِ شعر میں کچھ ترقی نہیں ہو سکتی۔ رہی یہ بات کہ اُستاد شاگرد کے پست کلام کو بلند کر دے یا شاگرد کو اپنا ہمسر بنا دے، سو یہ امر خود اُستاد کی طاقت اور اختیار سے باہر ہے۔ اگر اُستادوں میں شاگردوں کو اپنا ہمسر بنانے کی طاقت ہوتی تو ملّا نظامی صاحبزادے کو یہ نصیحت

نہ کرتے ؎

در شعر مجو بلند نامی　　　کایں ختم شدست بر نظامی

اور اگر کمال شاعری کے لئے کسی کا تلمذ اختیار کرنا ضروری ہوتا تو سنائیؔ، نظامیؔ، سعدیؔ، خسروؔ اور حافظ کے ضرور ایسے اُستاد نکلتے جن کی شہرت شاگردوں سے زیادہ نہیں تو اُن کے برابر یا اُن سے کمتر تو ہوتی۔

حضرت ذوقؔ کے کمال سے انکار کرنے کی جرأت کس کو ہوگی لیکن اس جگہ صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ داغؔ ماں کے پیٹ سے ایک صحیح اور حقیقی شاعر بن کر پیدا ہوئے تھے اور خود اُن میں وہ صفات بوجہ احسن موجود تھیں جو کسی سخن گو کو "فطری شاعر" کا لقب دلا سکتی ہیں۔ اس میں کلام نہیں کہ قابل اُستاد کے ہونہار شاگرد میں وہ خصوصیت موجود نہیں جیسے حکاک الماس کے ساتھ کہ اس میں جِلا پیدا کر دیتا ہے لیکن اگر پتھر میں چمکنے کی قابلیت ہی سرتاپا مفقود ہو تو حکاک کیا کر سکتا ہے۔

الغرض داغؔ کی شہرت کا دائرہ روز بروز وسیع ہوتا گیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ قلعۂ معلّیٰ میں اکثر شاہزادے بڑے بڑے اساتذہ کو چھوڑ اُن سے اصلاحِ سخن لینے لگے اور دلّی کا کوئی مشاعرہ بارونق نہ سمجھا جاتا تھا جس میں داغؔ زمزمہ سنج نہ ہوں لیکن غدر ۱۸۵۷ء نے رنگ میں بھنگ کر دیا۔ مجلسیں برہم ہو گئیں۔ جلسے منتشر ہو گئے۔ نہ قدرداں رہے نہ قدردانی کے سامان۔ اسی حسرت ناک سین کی تصویر پُر اثر الفاظ میں داغؔ نے یوں کھینچی ہے ؎

عجیب شکل گُل و گلستاں نظر آئی　　　پڑیں جدھر کو نگاہیں خزاں نظر آئی
جب اُٹھ کے تا مژہ خونفشاں نظر آئی　　　تو کوئی عیش کی صورت نہ یاں نظر آئی

وہ گُل رخانِ سمن بر کے قہقہے نہ رہے
وہ بلبلانِ خوش الحاں کے چہچہے نہ رہے
زمین کے حال پر اب آسمان روتا ہے
ہر اک فراقِ مکیں میں مکان روتا ہے
گدا و شاہ ضعیف و جوان روتا ہے
غرض یہاں کے لئے اک جہان روتا ہے
جو کہیے جوششِ طوفاں نہیں کہی جاتی
یہاں تو نوح کی کشتی بھی ڈوب ہی جاتی

صحت واقعات اور تاثیرِ سخن کے لحاظ سے داغ کا یہ مسدس شہر آشوب مستقل دلچسپی کی چیز ہے۔ اور بھی شعرا نے دہلی کے مرثیے لکھے ہیں لیکن داغ کو کوئی نہیں پہنچا۔ معلوم نہیں داغ نے اس مسدس کا یہ آخری شعر ؎

الٰہی! پھر اسے شاد و آباد دیکھیں ہم
الٰہی! پھر اسے حسبِ مراد دیکھیں ہم

کس وقت اور کس دل سے کہا تھا کہ اُن کی یہ آرزو پوری ہو کر رہی۔ حضور جارج پنجم خلد اللہ ملکہ، نے دہلی کو ہندوستان کا دارالسلطنت قرار دے کر اس قدیم شہر کی عظمت و شان کی روایات کو زندہ کرنے کا سامان بہم پہنچا دیا ہے۔ کاش داغ اس وقت زندہ ہوتے اور دیکھتے کہ ان کی دُعا بے کار نہیں گئی۔

دہلی کی بربادی گویا فصل خزاں تھی۔ جس طرح بہار کے خاتمہ پر باغ کی ساری دلچسپیاں معدوم ہو جاتی ہیں اسی طرح غدر کے بعد دہلی اسی طرح تاراج اور ویران ہو گئی تھی کہ اور تو اور خود وہاں کے باشندوں کو بھی دلی کا قیام دوبھر تھا۔

اب یہاں کی زندگی میں وہ "چٹخارے" مفقود ہو چکے تھے جو حیوان مطلق کو بھی اپنی

جگہ سے ہلنے نہ دیتے تھے۔ ذوق کا مقولہ کہ

کون جائے ذوق پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر

علمی حیثیت سے بے معنی الفاظ کا مجموعہ بنا ہوا تھا غالب کے اس مصرعہ کی صداقت آفریں کیفیت دلوں پر طاری ہو رہی تھی۔ ع

ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہے کھائیں گے کیا

ذاتی ضروریات اور فکرِ معاش سے مجبور ہو کر کملائے دہلی کا مجمع منتشر ہوا اور جس کی جدھر بن آئی چلتا بنا۔ اُس زمانے میں ریاست رام پور علمی قدر افزائی کی وجہ سے مشہور ہو رہی تھی۔ اسیرؔ، امیرؔ، تسلیمؔ، جلالؔ، قلقؔ، ایسے نامی گرامی شعراء کی ذات سے دربار کو زینت حاصل تھی۔ نواب مرزا داغؔ بھی باامید قدردانی رام پور پہنچے۔ اس وقت نواب یوسف علی خاں ناظم مسند آرا حکومت تھے۔ علم دوستی اور معارف پروری کا مادّہ اُن کی خلقت میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ ایک طرح سے وہ داغؔ کے اُستاد بھی تھے۔ داغؔ نے سکندر نامہ اُنھیں سے پڑھا تھا اس لیے انھوں نے داغؔ کو بہت خندہ پیشانی سے خیر مقدم کہا۔ نواب کلب علی خاں کا زمانہ ولی عہدی تھا۔ یہ ان کے مصاحب مقرر ہوئے اور بالآخر داروغہ اصطبل کی خدمت اُن کو تفویض ہوئی

داغؔ جب تک رام پور میں رہے بہت بے فکری اور آرام سے رہے۔ نواب کلب علی خاں جب حکومت پر پہنچے تو اُن کے وقت میں رام پور لکھنؤ بنا ہوا تھا۔ اور وہ خود گویا آصف الدولہ تھے۔ امیرؔ، داغؔ اور ان کے اکثر معاصر اسی دریا دل نواب کے خوان کرم کے ریزہ چیں تھے۔ نواب کا دربار علمی و ادبی نکتہ خیال

سے جلال الدین اکبر کا دربار تھا۔ جس میں یہ صاحبان فضل و کمال بجائے خود نو رتن اکبری کے قائم مقام تھے۔

قیام رام پور کے زمانے میں داغ کی شہرت کا حلقہ اور بھی وسیع ہوتا گیا۔ وہاں آئے دن مشاعرے ہوتے تھے۔ حکمرانِ وقت خود شعر و سخن کا شیدائے غالی تھا۔ یہ امر عام کی حوصلہ افزائی کا سب سے بڑا سبب ثابت ہوا۔ اُردو شاعری کے آخری دَور کے سارے قائم مقام گویا رام پور میں تھے پھر اُن مشاعروں کی گوناگوں دل چسپیوں کا اندازہ ہو سکتا ہے جس میں امیرؔ، داغؔ، تسلیمؔ وغیرہ ایسے جیّد شاعر طبع آزمائی کرتے ہوں۔ ان شعراء میں سے ہر ایک بجائے خود آسمان سخن کا ایک درخشندہ ستارہ تھا کسی ایک کو دوسرے پر فضیلت دینا ایک حد تک قرین انصاف نہ ہوگا لیکن داغ کی زبان، اُن کا تخیل، اُن کا رنگ آغاز شاعری سے ممتاز تھا اور یہ امتیاز رام پور میں اور پختگی حاصل کرتا گیا۔ جہاں اور بہت سے سخن گو نفس شاعری کے لحاظ سے یک رنگ اور یکساں تھے وہاں صرف داغ کی سب سے جداگانہ حیثیت تھی۔ اکثر شعراء کا کلام صرف مشاعرے تک محدود رہتا لیکن داغ کی غزلیں جو مشاعرے میں پڑھی جاتیں داد و تحسین کے ساتھ ساتھ شہرت پذیر ہو جاتی تھیں۔ امیر مرحوم بجائے خود اُردو شاعری کے ممتاز شاعر تھے لیکن یہ بات اُن کے کلام کو بھی نصیب نہ تھی حالانکہ ذاتی جوہر کمال کے سوا نوابِ وقت کو مشورہ سخن دینے کی عزت اُن کے کلام کی شہرت کا خاص اور موثر ذریعہ بن سکتی تھی۔

جب تک نواب کلب علی خاں زندہ رہے اہلِ دربار اُن کے قدموں سے لگے

رہے۔ نواب کی ذات اُن لوگوں کی تقویت کا باعث تھی۔ کم از کم فکرِ معاش سے سبھوں کو نجات تھی۔ داغ اُن لوگوں میں تھے جو امیر کے بعد نواب کی قدر شناسی کے مرجع طور پر حقدار تھے۔ داغ بھی احسان فراموش نہ تھے۔ ان کے اوّلین دیوان میں جا بجا اس کا ثبوت ملتا ہے مثلاً چند شعر درج کئے جاتے ہیں ؎

دست نواب گہر بار فلک دریا پار
داغ برسات نئی آئی ہے برسات کے ساتھ

جس کو ہو داغ حسن شجاعت پہ غرور
میرے نواب بہادر کے مقابل آئے

سب ہے کیا مصطفےٰ آباد میں داغ
مزے سارے تھے وہ خلدِ آشیاں تک

ہر چند رام پور میں گھبرا رہا ہے دل
کس طرح جائے کلب علی خاں کو چھوڑ کر

نواب خلد آشیاں کے ساتھ اُنہیں بھی فریضۂ حج بیت اللہ ادا کرنے کا موقع ملا تھا چنانچہ کہتے ہیں ؎

ساتھ نواب کے حج کر کے پھرے ہم اے داغ
ہند میں دھوم ہے مہمانِ حجاز آتے ہیں

غرض کہ نواب کلب علی خاں کی فیاضی نے داغ کو اور افکار سے فارغ البال [کر] دیا تھا۔ پھر اُنہیں کہیں دریوزہ گری کی کبھی ضرورت نہیں ہوئی۔ صرف ایک مرتبہ [کل]کتہ کے سفر کا اتفاق ہوا تھا جس کی دل چسپ کیفیت سے مثنوی فریادِ داغ کے [ص]فحات بھرے ہیں۔ داغ عظیم آباد میں بھی ٹھہرے تھے اور غالباً اُن کی وجہ ذیل

غزل وہیں کی دین ہے۔

بھویں تنتی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں
کسی سے آج بگڑی ہے جو بانکے بن کے بیٹھے ہیں

جیساکہ اس کے مقطع سے بھی ظاہر ہوتا ہے ؎

کوئی چھینٹا پڑے تو داغ کلکتے چلے جائیں
عظیم آباد میں ہم منتظر ساون کے بیٹھے ہیں

پٹنہ میں داغ کی موجودگی میں مجلس مشاعرہ بھی منعقد ہوئی تھی افسوس ہے کہ اس کے متعلق تفصیلی حالات نہیں مل سکے ورنہ مستقل دل چسپی کی چیز ہوتے۔ ان کے کلام کا شہرہ مختلف اقطاع ہند میں پہنچ چکا تھا۔ ساکنانِ کلکتہ نے ان کو سرآنکھوں پر لیا۔ دعوتیں ہوئیں۔ آؤ بھگت کی گئی مشاعرے ہوئے غرض علمی طبقے میں ان کے جانے سے غیر معمولی جوش پیدا ہو گیا تھا مہمان پر بھی خاطر مدارت نے بہت اثر کیا۔ اور جب وہ کلکتہ سے واپس ہوئے ہیں تو عرصہ تک وہاں کی یاد دل سے محو نہیں ہو سکی۔ اسی کیفیت کا اظہار ان لفظوں میں کیا ہے ؎

یہ حسیں یہ مہ جبیں یہ شہر ایسی لہر بہر
داغ کلکتے سے ہزاروں داغ دل پر لے چلا

اس سفر کے مفصل حالات فریاد داغ میں شاعرانہ انداز سے قلم بند کئے گئے ہیں جب ہم داغ کے یہ اشعار دیکھتے ہیں ؎

آئی ایسی ہوائے کلکتہ — دل پکارا کہ ہائے کلکتہ
ریل پر دوستانِ نیک خصال — آئے اکثر برائے استقبال

شہر میں دھوم تھی کہ داغؔ آیا　　داغؔ آیا تو باغ باغ آیا

تو ذہن اضطراری طور پر غالبؔ کے ان اشعار وں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جن میں وہ اپنی غریب الوطنی کی حالت اور اہل کلکتہ کی نامہری کا فوٹو یوں کھینچتے ہیں ؎

اے رئیسان ایں سواد عظیم　　اے فراہم شدہ ز ہفت اقلیم

ہمچو آرمیدۂ ایں شہر　　بہ ہر کارے رسیدۂ ایں شہر

اسد اللہ بخت برگشتہ　　در خم پیچ عجز سرگشتہ

گرچہ ناخواندہ مہماں شماست　　بے سخن ریزۂ چیں خواں شماست

بہ تظلم رسیدہ است ایں جا　　باُمید آرمیدہ است ایں جا

آں رہ و رسم کارسازی تو　　شیوۂ مہماں نوازی تو

با من ایں خشم وکیں دریغ دریغ　　من چناں تا چنیں دریغ دریغ

مصطفےٰ آباد یا رامؔ پور میں جو بزم سخن نواب کلب علی خاں کی علم دوستی کی بدولت برپا ہوئی تھی وہ اُن کی زندگی تک قائم رہی اور دن دونی رات چوگنی ترقی کے ساتھ، لیکن نواب نامدار کی آنکھیں بند ہوتے ہی گویا وہ بھی خواب و خیال تھی۔ افلاطون نے اپنی کتاب "ری پبلک" میں حکومت کے لئے شاعروں کی ضرورت نہیں سمجھی۔ رامؔ پور میں بھی جب نواب کلب علی خاں کے بعد اصلاح کا کام جاری ہوا تو سب سے پہلے اُنہیں شاعروں کا گروہ فضول ثابت ہوا جو خلد آشیاں کے زمانہ میں اراکین دربار میں خصوصی حیثیت رکھتے تھے۔ داغؔ کا تعلق بھی ریاست سے جاتا رہا اور

اُنہیں اپنی زندگی میں پھر ایک دفعہ اُن کلفتوں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا جن سے دلّی کی تاراجی کے بعد سابقہ۔ اُن کی رُباعی اس وقت کی دِلی افکار کا آئینہ اور اُن کی حقیقتِ حال کا مرقع ہے ؎

مر مر کے کٹے گی زندگانی میری

دنیا کا یہ قاعدہ ہے کہ تکلیف کے بعد آرام اور رنج کے بعد خوشی میّسر ہوتی ہے چنانچہ کچھ عرصہ تک خانہ نشین اور بے کار رہنے کے بعد داغ حیدرآباد پہنچے اور فرمانروائے دکن کی دریانوالی اور فیاض منشی نے اُنہیں آخر اُس رتبے تک رہنمائی کی جس سے زیادہ کی اُمید وہ کبھی خود نہ کرسکتے تھے۔

حضور مغفور میر محبوب علی خاں آصف کا دربار ہمیشہ سے مرجع اہلِ کمال رہ چکا ہے اور سلاطین اسلام کی علم دوستی اور معارف شناسی کی روایات اُن کی ذات بابرکات سے زندہ۔ حضرت داغ انہیں کے دامن دولت سے وابستہ ہوکر ماہتاب بن کر چمکے۔ ورنہ اُن کی وقعت بہ حیثیت ایک شاعر ملک میں تو ہوتی لیکن اعزاز وجاہ کے یہ مراتب وہ کبھی نہ طے کرسکتے۔

۱۸۸۸ء میں داغ سب سے پہلے حیدرآباد گئے۔ پبلک نے تو نہایت گرم جوشی سے اُنہیں ہاتھوں ہاتھ لیا لیکن متوسلین ریاست کی جاں فشانیوں کے باوجود اُس زمانے میں ان کی رسائی حضور تک نہ ہوئی اور ایک عرصہ تک قیام کرنے کے بعد آخر داغ گھبرا گئے اور ناامید ہوکر واپس چلے آئے۔ لیکن جن لوگوں کو حیدرآباد کی زندگی کا تجربہ ہے اُنہیں معلوم ہے کہ وہاں کاربرآری بہت دیر میں ہوتی ہے۔ داغ کا بھی یہی حال ہوا۔ اُن کے واپس آجانے کے بعد بھی کچھ دنوں کوئی خبر نہ لی گئی تو یہ

بالکل مایوس ہوگئے لیکن جس طرح گھٹا ٹوپ بادل سے سورج کی کرن ظاہر ہو جاتی ہے۔ اسی طرح داغ کی مایوسی یکایک مبدّل بہ شادمانی ہوگئی۔ برسوں کی آرزوئیں اور تمنائیں کی دعائیں آخر پوری ہوئیں اور انہیں ایک معمولی شاعر کے طور پر نہیں بلکہ استادِ سلطان کی حیثیت سے حیدرآباد جانا پڑا۔ داغ کی یہ کامیابی غیر معمولی تھی اسی لئے اس خبر کو تمام ہندوستان میں کسی قدر تعجب سے سنا گیا تھا لیکن دربار آصف جاہی کے لئے یہ اعزاز و اکرام کوئی نئی بات نہ تھی۔

داغ کی پہلی تنخواہ ساڑھے چار سو روپیہ مقرر ہوئی تھی لیکن پھر پندرہ سو روپیہ ماہوار تک پہنچ گئی تھی۔ عطئے اور انعامات اس کے ماسوا ہیں۔ ان کے اہلِ خاندان میں سے اکثر کو بخشش قرار وظائف معیّن تھے غرض کہ حیدرآباد جانا نہ صرف داغ کے لئے ذاتی طور پر بلکہ اُن کے اعزا و اقارب کے بھی نہایت کارآمد ہوا، اور وہ آخر وقت تک عیشِ مخلّد میں بسر کرتے رہے۔

بیرون شہر افضل گنج حیدرآباد کا ایک مشہور محلّہ ہے۔ اس میں ایک خاص حصّہ محبوب گنج کے نام سے موسوم ہے۔ یہاں اجناس وغیرہ کی دکانیں ہیں۔ عام طور پر یہاں لوگ سکونت پذیر نہیں ہیں لیکن داغ غالباً ١٨٩١ء تک یہیں ایک مکان میں جو بظاہر کچھ وسیع اور شاندار نہ تھا رہتے تھے۔ میرے ایک دوست قیصر حیدرآبادی مرحوم جو ایک نوجوان شاعر تھے اور داغ صاحب کے ہم سایہ ہونے کی وجہ سے اُن کے اکثر عزیزوں سے رسم اتحاد رکھتے مجھ سے بیان کرتے تھے کہ محبوب گنج کا قیام باوجود اُس جگہ کی ناگوار آب و ہوا کے اس شگون پر مبنی تھا کہ اُس مکان میں ٹھہرنے کے بعد ہی داغ صاحب کو حضور نظام کے پاس رسوخ حاصل ہوا تھا۔ لیکن آخر میں

وہ رزیڈنسی کے علاقہ میں ایک شاندار اور پُرفضا کوٹھی میں چلے گئے تھے اور پھر وہیں آخر دم تک رہے۔

حیدرآباد کے تعلقات نے داغ کی شہرت کو گویا پَر لگا دیئے اور واقعی حضور نظام مرحوم کی فیاضی اور جود کی بدولت انہیں وہ دُنیاوی اعزاز نصیب ہوا جس کی مثال پچھلی تاریخ میں نہیں مِل سکتی۔ سودا نے آصف الدولہ کے دربار میں اعزاز حاصل کیا۔ سید انشا نے سعادت علی خاں کی توجہات سے فائدہ اُٹھایا۔ ذوق شہنشاہ دہلی کے اُستاد تھے۔ لیکن یہ باتیں اب پُرانی ہو گئی تھیں۔ البتہ بچشم خود مشاہدہ کرنے والے لوگ ہندوستان میں عموماً موجود ہیں خصوصاً ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں اب تک زندہ ہیں۔ انہیں نہ صرف مشورۂ سخن کی عزت حاصل تھی بلکہ درباری اشخاص میں بھی اُن کو نمایاں فوقیت اور ترجیح تھی۔ اُستاد السلطان ناظم یار جنگ دبیر الدولہ فصیح الملک جہاں اُستاد کے خطاب سے سرفراز ہوئے اور یہ خطابات اس قدر مشہور ہوئے کہ اُن کے تخلص کے بعد گویا اُن کے اصلی نام کے مترادف بن گئے تھے۔

داغ کی موجودگی حیدرآباد ایشیائی شاعری کے فروغ کا خاص سبب ثابت ہوئی۔ اور شروع شروع میں تو شعر گوئی کا وہ چرچا ہوا کہ معمولی الفاظ میں اُس کی کیفیت بیان نہیں کی جاسکتی۔ مشاعروں کی کثرت کے ساتھ شعراء کی تعداد میں بھی غیر معمولی اضافہ ہوتا رہا یہاں تک کہ آج بھی جس قدر شاعر خاص حیدرآباد میں موجود ہیں اُتنے ہندوستان کے کسی اور شہر میں نہیں نکل سکتے اور اُن میں سے اکثر نہایت خوش فکر واقع ہوئے ہیں۔

ابتدائی زمانے میں تو کوئی مشاعرہ ایسا نہ ہوتا تھا جس میں داغ باوجود مواقع کے شرکت پر مجبور نہ کئے جاتے ہوں لیکن آخر میں وہ عام مجالس میں کم شریک ہوتے

تھے۔ محمد ابراہیم صاحب خانساماں حضوری کے یہاں سالانہ محفل شعر وسخن منعقد ہوتی تھی۔ اس میں اعلیٰ حضرت حضور آصف جاہ مرحوم کی غزل بھی آتی تھی۔ داغ اُسے پڑھتے تھے اس لئے اس مشاعرہ میں ان کی شرکت بالعموم ہوجایا کرتی تھی۔ اسی طرح اور خاص خاص مشاعروں میں جایا کرتے تھے لیکن انحطاطِ عمر کے ساتھ بہ وجہ کبرسنی وضعیف العمری یہ التزام بھی باقی نہ رہا۔

سنہ ۱۹۰۰ء میں امیر مینائی مرحوم مغفور باامید سرفرازی حیدرآباد آئے اور داغ کے مکان پر فروکش ہوئے اُمید ہوئی تھی کہ انہیں سرفرازی کا موقع ملے گا اور ان دونوں اُستادوں کی معرکہ آرائیوں کا لطف جس کو اخباروں میں پڑھا اور کانوں سے سُنا تھا ذاتی طور پر اُٹھانے کا موقع ملے گا۔ لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ امیر مرحوم کو حیدرآباد کی آب و ہوا کچھ ایسی ناموافق ہوئی کہ وہ ایک دن بھی اچھے نہ رہے۔ سوءِ مزاجی کا سلسلہ آخر کار موت پر منتہی ہوا اور شیدائیانِ سخن کی حسرت خاک میں مل گئی۔ اہلِ حیدرآباد کو آپ کے واقعۂ ارتحال کا جو صدمہ ہوا اُس کا اندازہ غیر ممکن ہے۔ حضرت داغ کو بھی اپنے ایک پرانے رفیق اور ہم مشرب کی موت کا بے حد قلق ہوا۔

امیر مرحوم کے انتقال کے تقریباً پانچ برس بعد داغ نے بھی داعی اجل کو لبیک کہا۔ ۹ رذی الحجہ ۱۳۲۲ھ مطابق ۱۴ رفروری ۱۹۰۵ء اُن کا روزِ وفات ہے اور اب وہ بہ مقام حیدرآباد درگاہِ حضرت یوسف شریف قدس سرہ العزیز کے احاطہ کے اندر امیر مرحوم کے پہلو میں آرام کی نیند سو رہے ہیں۔ سچ کہا ہے ؎

دو چیز آدمی را ستاند بزور
یکے آب و دانہ دوم خاک گور

قدرت کی نیرنگیاں بھی عجیب ہیں۔ کہاں دہلی اور کہاں حیدرآباد، لیکن داغ کے خمیر میں دکن کی مٹی تھی آخر وہیں پیوندِ خاک ہوئے اور شعر و سخن کی یہ شمع اس طرح عالمِ غربت میں "کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ" کے ایک جھونکے سے گُل ہوگئی۔

داغ کی موت معمولی موت نہ تھی بلکہ اُن کے مرنے سے ملک کا ایک باکمال شخص اُٹھ گیا تھا اور بزمِ سخن سے ایک ایسی جگہ خالی ہوگئی تھی جس کے پُر ہونے کی اب صدیوں اُمید نہیں ہوسکتی۔ پبلک نے اس نقصان کو غایت درجہ محسوس کیا تھا اور شعراء نے تاریخیں نکالیں۔ اخبارات نے تعزیتی مضامین شائع کیے۔ مدرسوں اور سوسائٹیوں نے اُن کے ماتم میں یادگاری جلسے منعقد کیے۔ ڈاکٹر اقبال جنھیں ابتداء میں داغ سے تلمذ بھی تھا اُن کا مادۂ تاریخ "نواب مرزا داغ" معنوی خوبیوں، اختصار، اور برجستگی کے لحاظ سے سب میں ممتاز سمجھا گیا تھا۔ اُن کی ماتمی نظم بھی سوز و گداز کا ایک موثر موقع ہے۔ جن درد ناک الفاظ میں داغ کے تاسف خیز واقعۂ مرگ کا بیان کیا گیا ہے اُن کی کیفیت ان منتخب اشعار سے ظاہر ہوسکتی ہے ؎

چل بسا داغ آہ میت اُس کی زیبِ دوش ہے
آخری شاعر جہاں آباد کا خاموش ہے

تھی زبانِ داغ پر جو آرزو ہر دل میں ہے
یعنی یہ لیلےٰ وہاں بے پردیاں محمل میں ہے

کم نہیں محشر سے کچھ ایسی صدا کی خامشی
آہ دل سوزی تو تھی گو نقطہ آموزی نہ تھی

لکھی جائیں گی کتابِ دل کی تفسیریں بہت
ہوں گی اے خوابِ جوانی تیری تعبیریں بہت

ہو بہ ہو کھینچے گا لیکن عشق کی تصویر کون
اُٹھ گیا ناوک فگن مارے گا دل پر تیر کون

رشک کے دانے زمینِ شعر میں بوتا ہوں میں
تو بھی رُو اے خاکِ دلّی داغ کو روتا ہوں میں

وہ گلِ رنگیں ترا رخصت مثالِ بو ہوا
یعنی خالی داغ سے کاشانۂ رخصت تو ہوا

ہز اکسلنسی مہاراجہ سرکشن پرشاد نے جو حضرت آصف غفران مکان کے تلمیذ رشید ہونے کی حیثیت سے داغ ہی کے شجرۂ شاعری کی ایک سرسبز اور ثمربار شاخ ہیں کس قدر سچی تاریخ انتقال نکالی ہے۔ ع

دہلی کا چراغ بجھ گیا آہ

۱۳۲۲ھ

اس میں شک نہیں کہ ایشیائی شاعری کی آخری رونق ہندوستان میں داغ کے دم سے تھی، اور جہاں تک ان کے مرنے سے نہ صرف دُنیائے اُردو کا ایک سرمایۂ ناز شاعر اُٹھ گیا بلکہ اُسی کے ساتھ دلّی کی امتیاز و وقعت بھی رخصت ہوگئی۔

داغ حضرت ذوق کے تلمیذ رشید تھے لیکن دنیاوی جاہ و منزلت اور ذاتی شہرت کے اعتبار سے وہ کسی کے شرمندۂ احسان نہ تھے۔ اُن کے تمام اعزاز و مناصب اُن کی اکتسابی چیزیں تھیں۔ اُن کے کمال نے اُنہیں اس درجہ پر پہنچایا اور اُن کے کلام نے اُنہیں قبولیت عامہ کی سند دلوائی۔ کسی شاعر کے کلام کا اس کے عینِ حیات میں شہرت پذیر ہوجانا شاعر کے خاص فخر و مباہات کا سبب ہوتا ہے اور اس امر میں داغ سب سے

زیادہ خوش نصیب ثابت ہوئے ہیں ۔ ان کی زندگی ہی میں اُن کی غزلیں تمام ہندوستان میں پڑھی اور گائی جاتی تھیں ۔ اس وقت بھی کوئی مجلس نشاط داغ کے گرما گرم کلام کے بغیر رونق نہیں حاصل کر سکتی ۔ سودا ، میر ، جرأت ، اور اُن کے علاوہ اور بھی اکثر شعراء کا کلام اُن کی زندگی میں مشہور ہو گیا تھا ، بلکہ میر کی غزلیں دلّی سے بہ طور تحفہ کے لکھنؤ جایا کرتی تھیں لیکن داغ کا شہرہ سب سے زیادہ وسیع اور پائدار رہا ہے اس زمانہ کے دو چار شاعروں کا کلام ایک حد تک مطبوع خلائق ضرور رہے مثلاً ریاض اور مضطر جو علی الترتیب شوخ بیانی اور مطالعہ بندی میں خاص ملکہ رکھتے ہیں لیکن ان کی شہرت صرف چند غزلیات تک محدود ہے ۔ امیر مینائیؒ کا بھی یہی حال ہے آج کل اُن کی چند غزلیں کبھی کبھی حقانی رنگ میں سُننے میں آجاتی ہیں ورنہ اُن کی زندگی میں تو شاید اُن کا ایک شعر بھی ایسا نہ تھا جو خاص و عام کی زبان پر ہوتا ۔ اُن الفاظ سے اُن کی کسرِ شان مقصود نہیں بلکہ اظہار حقیقت مقصود ہے ۔ شہرت اور ہر دلعزیزی خداداد باتیں ہیں اس میں انسان کی کوشش کو مطلق دخل نہیں ۔

داغ کی غزلیں جس سُرعت کے ساتھ خاص و عام تک پہنچ جاتی تھیں اُن کا اندازہ ان سطور سے ہو سکتا ہے ۔ مولوی علی حیدر صاحب طباطبائیؒ مالک الدولہ کا قابل قدر مضمون ہیں جو بہ اقساط رسالۂ ادیب میں نکل چکا ہے فرماتے ہیں ۔

ایک غزل اُنہوں نے (داغ نے) اپنی سُنائی کہ تازہ فکر ہے ؎

پھرے راہ سے وہ یہاں آتے آتے　　　اجل مر رہی تو کہاں آتے آتے

ساری غزل مرصّع اور نہایت برجستہ تھی مگر اس شہرت عام کو دیکھئے کہ وہاں سے میں اُٹھا تو راہ میں وہی غزل گائی جا رہی تھی ....

اس شہرتِ عام اور مقبولیت کے اسباب جو کچھ رہے ہوں لیکن اس کی سبب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ داغؔ کا کلام خواص اور عوام دونوں کے مذاق کے مطابق ہے اور اُس پر زبان کی صفائی اور خیالات کا نیچرل اور موثر ہونا گویا سونے میں سہاگہ تھا کہ سامع کو روحانی سرور حاصل ہوتا اور اُس کے دل و دماغ ایک خاص کیفیت سے متاثر ہو جاتے تھے۔ بعض خوش فہموں کی رائے ہے کہ داغؔ نے "چوما چاٹی" کے مضامین نظم کر کے عوام کے قلوب کو مسخر کر لیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ اعتراض بہت بڑی حد تک صحیح ہے۔ اور جہاں تک طبقۂ عوام کا تعلق ہے داغؔ کی مقبولیت بہت کچھ اسی سبب سے ہے لیکن آخر خواص اُن کے کلام کے کیوں دلدادہ ہیں؟

اس مبحث پر پہنچ کر کسی قدر تفصیل سے لکھنے کی ضرورت معلوم ہوتی ہے لیکن ہم اپنا عندیہ ظاہر کرنے میں اختصار کو ہاتھ سے جانے نہ دیں گے۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو اُردو شاعری کی بنیاد ہی "چوما چاٹی" پر رکھی گئی ہے انسانی فطرت اور صحیفۂ قدرت کا مطالعہ ہمارے شعراء نے گویا کیا ہی نہیں۔ اور اگر نظر کو اُس سے وسیع کیا جائے تو ثابت ہوگا کہ غزل اسی قسم کے مضامین کے لیے ابتداءً موضوع بھی ہوئی تھی۔ لیکن ازمنۂ وسطیٰ میں اُس کی یہ خصوصیت قائم نہیں رہی بلکہ عشق و محبت کے ساتھ معرفت توحید، اخلاق، تصوّف، سیاست، سماجیات وغیرہ چڑھا دیئے گئے ہیں۔ لیکن مبصرین کی خیال ہے کہ یہ صنف زیادہ تر عشقیہ شاعری ہی کے لیے موزوں ہے۔ متقدمین میں سے اکثر نے ان جذبات کو قلم بند کیا ہے جن سے عشقِ حقیقی مترشح ہوتا ہے لیکن کثیر التعداد شاعروں نے عشقِ مجازی کی حدود سے باہر قدم نہیں رکھا۔ اُن کے دیوان گواہی دے سکتے ہیں کہ اس بیان میں صداقت کا حصہ کتنا ہے یا درہے کہ معمولی عشقیہ باتوں کو کھینچ تان کر معرفت کا لباس پہنانے کی

.ıll .ıll 0.53KB/s 4:32 70%

طرفدارانہ کوشش کی جائے۔ اس بات کا اعتراف کیا جا سکتا ہے کہ متقدمین معاملہ بندی کو پسند نہ کرتے تھے یا خلوت ووصل کے بے تکلفانہ واقعات کا ذکر کھلے الفاظ میں کرنے سے رُکتے تھے۔ لیکن متوسطین نے یہ التزام قائم نہیں رکھا۔ میرؔ نے غزلیات کو جس رنگ میں لکھا تھا اُسے جراُتؔ نے نہایت شوخ کر دیا تھا اور داؔغ مرحوم کے قلم نے تو بعض مناظر اس بے باکی سے دکھائے ہیں کہ بعض اوقات تنہائی میں بھی اُن کا مطالعہ ناظر کو عرق عرق کر دیتا ہے۔ مثلاً یہ اشعار اعتدال اور متانت سے بہت دور ہیں۔ ان میں سے بعض صاف گوئی کا تاریک پہلو بہ خوبی دکھا سکتے ہیں ؎

مزا ہو وصل کی شب اس طرح ہوں پیار کی باتیں
ہمارا ہاتھ سینے پر تمہارا ہاتھ گردن میں

زلف برہم، عرق آلودہ جبیں، دامن چاک
کس کے آغوش سے تو جان چھڑا کر نکلا

یاد ہے کہنا وہ کسی وقت کا — ہوش میں آؤ تمہیں کیا ہو گیا

نکل کر مرے گھر سے یہ جان لو تم — نہ ہوگا کسی گھر گذرا تمہارا
سُنا ہے کسی اور کو چاہتا ہے — وہ دشمن ہمارا وہ پیارا تمہارا

بنا ہو یہ کہیں غیر کے سر کا تکیہ — مُسکراتے ہیں وہ کیوں دیکھ کے زانو اپنا

بعض اشعار میں سوقیانہ طرزِ تکلم کی جھلک پائی جاتی ہے مثلاً

کھُل کھیلیے، کھُل جایئے، دل کھُول کے ملیے

کب تک گرہ بند قبا کو کوئی دیکھے

نہ گئی تاک جھانک کی عادت

لیے پھرتی ہیں در بدر آنکھیں

بے خود رہے وصال میں بے ہوش ہجر میں

کیا جانے مجھ سے کب وہ ملا کب جُدا ہوا

دل میں عاشق کے تصوّر سے کھٹک ہوتی ہے

ان حسینوں کی غضب نوک پلک ہوتی ہے

یہ نزاکت کیوں اسی برتے پر دعویٰ قتل کا

کھول دو خنجر کمر سے پھینک دو شمشیر بھی

ہو گیا پرتوِ رخسار سے کچھ اور ہی رنگ

میں نے مُنہ چوم لیا اُس کے تماشائی کا

کیوں صرفۂ نگاہ میری جان ہو گیا　　اک تیر اور میں تیرے قربان ہو گیا

بیشک اس قسم کے خیالات قابل اعتراض ہیں اور خصوصاً آج کل جب کہ تعلیم کی اشاعت کے ساتھ انسانی دل و دماغ کی جِلا ہوتی اور نیک و بد کی تمیز آتی جاتی ہے، یہ اشعار کون پسند کرے گا؟ لیکن جو لوگ داؔغ کے تمام دواوین کو اسی قبیل کے مضامین سے مملو بتاتے ہیں وہ یقیناً بے خبر ہیں اور محض ایک عام قیاس کی بنا پر کہ داؔغ "چوماچاٹی" کی تصویر بہت دل کش الفاظ میں کھینچتے ہیں بلا امتیاز اُن کے سارے کلام کی تضحیک کرنے لگتے ہیں۔ وہ ٹھنڈے دل سے دیکھیں کہ تمام مجموعۂ کلام میں اس قسم کے کتنے شعر نکلتے ہیں اور پھر کوئی فیصلہ کن رائے قائم کریں۔ بڑی سے بڑی غزل میں بھی ایک دو سے زیادہ ایسے شعر نہ ملیں گے۔ جب حقیقت حال یہ ہو تو معترض خود انصاف کرے کہ اُس کا فعل کس حد تک درست ہے۔

بدنام کرنے کا ارادہ کرلینا اور بات ہے لیکن کیا داؔغ کے علاوہ کسی اور شاعر نے واقعات حسن و عشق نظم کرنے میں بے اعتدالی نہیں کی؟ بدرِ منیر، گلزارِ نسیم، زہرِ عشق، یہ تمام مثنویاں میانہ روی کے اصول سے کوسوں دور ہیں ان میں بعض بعض مقامات پر ایسے سین دکھانے کی کوشش کی گئی ہے جس کا نظارہ غیرت پسند طبائع کے لیے زہرِ قاتل سے کم نہیں۔ اس کے باوجود ان کے نئے ایڈیشن چھاپے جاتے اور تنقیدی دیباچے لکھے جاتے ہیں اور ان کے مسلمہ عیوب کی پردہ پوشی کرنے کے لیے خون اور پسینہ ایک کیا جاتا ہے۔ لیکن اگر ایسا کیا جاتا ہے تو ہمارے خیال میں یہ کوئی مواخذہ کی بات نہیں۔ کیوں کہ ان کتابوں میں بہت سے ادبی محاسن بھی ہیں جن کی وجہ سے ان میں مستقل دلچسپی کی شان موجود ہے۔ بعینہٖ یہی حال داؔغ کے کلام کا ہے۔ وہ ایک باغ ہے جس میں پھول بھی ہیں اور کانٹے بھی۔ ان چیزوں سے کسی کا چمن خالی نہیں۔ اگر داؔغ کا طرزِ بیان قعی کا نشانہ ہے تو انصاف کی نظروں میں امیؔر مرحوم کا دوسرا دیوان "صنم خانۂ عشق"

جس میں اسلوب تحریر اور زبان کے اعتبار سے داغ کے متتبع رنگ نمایاں طور پر موجود ہے۔ سرتاپا خارستان ثابت ہوگا۔ مگر ہم اس کے بھی خلاف ہیں۔ یہ سب یک طرفہ رائے ہوسکتی ہیں۔ اور منصف مزاجی اور راست بازی سے انہیں کوئی تعلق نہیں۔

یہ امر بزرگانِ لکھنؤ کی علمی قدردانی کی گذشتہ روایات کے سراسر منافی ہے کہ جہاں تمام ہندوستان نے کلامِ داغ کی مناسب عزت و توقیر کی، وہاں اہلِ لکھنؤ کی زبان سے کوئی حوصلہ افزا لفظ کبھی نہ نکلا۔ لیکن انھوں نے اپنے گریبان میں منہ ڈال کر نہ دیکھا کہ واسوخت امانت اور دیوان جانؔ صاحب کے مالک بننے کے بعد انہیں داغ پر خردہ گیری کا حق کیا ہے۔ مولوی علی حیدر صاحب اپنے فاضل نقاد بھی جہاں کہیں داغ کا ذکر کرتے ہیں تو تعریفی الفاظ میں تعریض کا پہلو نکال لیتے ہیں۔ مولوی صاحب ایسے بزرگ سے عموماً کوئی شکایت نہیں ہوسکتی کیوں کہ آخر یہ کچھ خدا لگتی بھی کہہ دیتے ہیں اور اُن کی علمیت، قابلیت اور تحقیق انہیں اسی قسم کی رائے زنی کا مستحق بناتی ہے خواہ اُن کے خیال سے صریح اتفاق نہ کیا جائے۔ لیکن الناظر بابت ماہ جون ۱۹۱۲ء میں ایک پردہ نشین مضمون نگار نے اپنی قوتِ فیصلہ کا ثبوت عجیب طور سے بہم پہنچایا ہے۔ کہاں کشمیر کا کوہستانی سبزہ زار اور کہاں داغ اور امیر کا قضیہ! معزز خاتون کے الفاظ یہ ہیں:-

> منشی امیر احمد صاحب مرحوم اور داغ مرحوم کا تذکرہ چلا۔ جب کوئی ان دونوں کا مقابلہ کرتا ہے تو مجھے بڑا غصہ آتا ہے۔ میں داغ کو بُرا نہیں کہتی وہ شاعر تھے امیر و داغ کا مقابلہ کیا۔ داغ شاعر تھے اور امیر اُستاد۔۔۔۔

اسے پڑھ کر مضمون نگار صاحبہ کے تبحر علمی اور وسعت نظری کا جو اندازہ لگایا تھا

وہ افسوس ہے کہ اُسی مضمون کے خاتمہ پر پہنچ کر غلط ثابت ہوگیا، آپ لکھتی ہیں:۔

خیالات نے بڑھتے بڑھتے بچپن کا زمانہ پیش کر دیا کیا زمانہ تھا کیا معصومیت تھی۔ سچ یہ ہے کہ بچپن کا زمانہ انسان کی زندگی کا بہترین حصہ ہے' مجھے تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ داغ مرحوم کی ایک رُباعی مجھ کو بہت پسند ہے اور وہ یہ ہے ؎

لگے پڑھنے جب سے کہ ہوش و خرد — لگیں ساتھ بڑھنے پریشانیاں
بڑھاپے کی دانائی لے کر کوئی — بدل دے وہ بچپن کی نادانیاں

یہ عبارت پڑھ کر بے اختیار ؎

چہ خوش گفت است سعدی در زلیخا
الا یا ایہا الساقی ادر کاسًا وناولہا

کی خندہ آفریں یاد آجاتی ہے۔ جو آدمی رُباعی اور قطعہ اور رد داغ اور رحائی کو ایک سمجھتا ہو وہ اپنی واقفیت کے لحاظ سے کسی علمی و ادبی مسئلہ کا تصفیہ کیا خاک کر سکتا ہے۔ ہاں اس قسم کی غیر ذمہ دارانہ تحریریں سوسائٹی کے اندرونی جذبات کا اظہار البتہ کر سکتی ہیں۔ بزرگانِ لکھنؤ نے داغ کے کلام کا صرف تاریک رُخ خود دیکھا اور راوروں کو دکھایا ہے۔ اُن میں حضرت امیر مرحوم ایسے انصاف پسند لوگوں کی مثال شاذ ہے جنھیں یہ کہنے میں کوئی چیز ہارج نہیں ہوئی کہ ؎

امیر اچھی غزل ہے داغ کی جس کا یہ مصرع ہے
بھویں تنتی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں

ہماری ذاتی رائے ہے کہ کلامِ داغ مجموعی حیثیت قابل گرفت ہرگز نہیں ہے [illegible] اگر اس میں کئی چیزیں قابل گرفت نظر آئیں گی تو بہت زیادہ لائق تعریف بھی ملیں گی۔ یہ

0.40KB/s 4:33 70%

کہنا کہ متین اور ستھرے جذبات اُن کی غزلیات میں مفقود ہیں، غلط ہے۔ اگر اُن کے تمام مجموعۂ کلام کا انتخاب اس طریقہ سے کیا جائے کہ قابل اعتراض شعر ایک بھی نہ رہنے پائے تاہم حصّۂ منتخبہ کی ضخامت کئی کئی دیوانوں کے برابر ہوگی۔ ہم اوپر کچھ اشعار جو کسی نہ کسی حیثیت سے گرفت کے لائق قرار پا سکتے ہیں لکھ چکے ہیں، اب ان کے بالمقابل یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

جلوے میری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں
مجھ سے کہاں چھپیں گے ایسے کہاں کے ہیں
قاصد یہاں سے برق تھا پر نصف راہ سے
بیمار کی ہے چال قدم ناتواں کے ہیں
کیسا جواب حضرتِ دل دیکھئے ذرا
پیغامبر کے ہاتھ میں ٹکڑے زباں کے ہیں

کھویا گیا ہوں دے کے پتہ نامہ بر کو مَیں
اپنی خبر کو جاؤں الٰہی کدھر کو مَیں
مجھ کو تباہ چشمِ مروّت نے کر دیا
مل جائے تو چُراؤں کسی کی نظر کو مَیں
جا کر درِ قبول پہ جھڑکی گئی دُعا
صد شکر آپ جا کے نہ لایا اثر کو مَیں

4

اس چمن میں گو برنگِ سبزۂ بے گانہ ہوں
گلُ ہے رنگین، ہو۔ میں اپنے رنگ کا دیوانہ ہوں
مجھ سے اے گبر و مسلماں کس لئے اتنا تپاک
قابل مسجد نہ ہرگز لائق بت خانہ ہوں

یاں دل میں خیال اور رہے واں مدِ نظر اور
ہے حال طبیعت کا ادھر اور اُدھر اور
ٹھہرا ہے وہاں مشورۂ قتل ہمارا
لو حضرت دل ایک سنو تازہ خبر اور

شوخی نے تیری کام کیا اک نگاہ میں
صوفی ہے بُت کدہ میں صنم خانقاہ میں
آنکھیں بچھائیں ہم تو بھی عدو کی راہ میں
پر کیا کریں کہ تو ہے ہماری نگاہ میں
دل میں سما گئی ہیں قیامت کی شوخیاں
دو چار دن رہا تھا کسی کی نگاہ میں
اُس توبہ پر ہے ناز تجھے زاہد اس قدر
جو ٹوٹ کر شریک ہو میرے گناہ میں

کیسا نظارہ، کس کا اشارہ، کہاں کی بات
سب کچھ ہے اور کچھ نہیں نیچی نگاہ میں

گزر گئے اسی گردش میں اپنے لیل و نہار
شبِ فراق گئی روزِ انتظار آیا
یہ حال تھا شبِ وعدہ کہ تا بہ راہ گزر
ہزار بار گیا میں ہزار بار آیا

پہلے تو سمجھتا ہوں کہ ہیں درپئے آزار
پھر دل میں یہ آتا ہے وہ ایسے تو نہیں ہیں

کون کہہ سکتا ہے کہ یہ اور اسی قسم کے ہزاروں اشعار کا مطالعہ وجدان صحیح پر گراں گذر سکتا ہے؟ البتہ اگر ان میں کبھی ؎

ہانپتا ہائی میں ہانپتے جانا کھلتے جاتے میں ڈھانپتے جانا

کا وہمی منظر کسی کے آگے محض اس وجہ سے آجائے کہ یہ داغ کے شعر ہیں تو اور بات ہے ورنہ کیا خیالات کی نفاست، جذبات کا ستھراؤ، زبان کی صفائی، مفہوم کی بلندی، یہ تمام صفات ان میں بدرجۂ غایت موجود ہیں اور داغ کے یہی اشعار سنجیدہ طبیعت والوں کو اپنی طرف متوجہ اور طبقۂ خواص کو مسخر کرتے ہیں اور سب سے بڑا سبب داغ کے کلام کی خاص و عام دونوں قسم کے افراد میں مقبولیت کا یہی ہے۔

ہم ذیل میں کچھ اور شعر درج کرتے ہیں ان سے پتہ چل سکتا ہے کہ داغ نے

سوسائٹی کے اعلیٰ طبقہ کی ضیافت طبع کے لئے کیسی کچھ لطیف روحانی غذائیں تیار کی ہیں ؎

جو عاشقی میں خاک ہوا کیمیا ہوا   کہتا تھا آج خاک میں کوئی ملا ہوا

داغ وہ بہتر ہے جو مرہم بنا   درد وہ اچھا جو دوا ہو گیا

مزا عشق کا کچھ وہی جانتے ہیں   کہ جو موت کو زندگی جانتے ہیں

کیا ڈبوئے گا تیرے عشق کا قلزم مجھ کو
موج ساحل ہے سفینہ ہے طلاطم مجھ کو
عمرِ دراز خضر کو کیوں ہو گئی عطا
یہ تو مجھے کسی کی محبت میں چاہئے

لطفِ ایذا طلبی کیا کہئے   درد آرام ہوا جاتا ہے

مندرجہ بالا انتخاب میں خصوصیت سے ایسے لئے گئے ہیں جن میں کسی نہ کسی پہلو سے حسن وعشق کا پہلو نکلتا ہے۔ ناظرین انصاف کریں کہ یہ جذبات اعلیٰ قسم کے ہیں یا ادنیٰ درجے کے ؟ جو لوگ کہیں کہیں اس طرح کے شعر ؎

تم کہتے ہو معشوق اطاعت نہیں کرتے
عاشق بھی تو معشوق کا نوکر نہیں ہوتا

دیکھ کر تعمیم و تخصیص کا درمیانی فرق قائم نہیں رکھتے اور کہنے لگتے ہیں کہ داغ کا عشق بازاری ہے وہ غور فرمائیں کہ داغ کے گلدستہ میں کانٹوں سے پھول بہت زیادہ ہیں۔ یہ غزل دیکھئے کس انداز میں کہی گئی ہے ؎

ثبات بحرِ جہاں میں اپنا فقط مثالِ حباب دیکھا
نہ جوش دیکھا نہ شور دیکھا نہ موج دیکھی نہ آب دیکھا

ہماری آنکھوں نے بھی تماشہ عجب عجب انتخاب دیکھا
بُرائی دیکھی بھلائی دیکھی عذاب دیکھا ثواب دیکھا

نہ دل ہی ٹھہرا نہ آنکھ جھپکی نہ چین آیا نہ خواب پایا
خُدا دکھائے نہ دشمنوں کو جو دوستی میں عذاب دیکھا

پڑے ہوئے تھے ہزاروں پردے کلیم دیکھو تو جب بھی غش تھے
ہم اُس کی آنکھوں کے صدقے جس نے یہ جلوہ یوں بے حجاب دیکھا

جو راہ میں تیری آکے بیٹھے وہ فکرِ دیر و حرم سے چھوٹے
جو تیرے کوچے کے ساکنوں نے بہشت میں بھی عذاب دیکھا

شرابِ غفلت سے داغ غش تھے دکھائے غفلت نے کیا تماشے
کہ سوتے سوتے جو چونک اُٹھے مگر کوئی تم نے خواب دیکھا

اسی طرح سینکڑوں اور ہزاروں متفرق شعر ایسے مل سکتے ہیں جو اخلاقی اور روحانی فوائد سے مملو ہیں یا جن میں معرفت و تصوف کے نکات کی موشگافی کی گئی ہے۔ جہادِ اکبر کی تعریف داغ کے الفاظ میں یوں ہے ؎

مارنا دل کا سمجھتا ہوں جہادِ اکبر
وہی غازی ہے بڑا جس نے یہ غازی مارا

حرص کا کارآمد ہونا کس خوبی سے ثابت کیا ہے ؎

یہ نہ کہئے کہ نہیں کام کی حرص
اور جو کافر کو ہو اسلام کی حرص

مطلب یہ ہے کہ اچھے کاموں کی حرص بھی اچھی ہے۔

انسانی طاقت کا غیر محدود اور پھر مجبور رہنا کتنے عام فہم طریقہ پر ذہن نشین کیا ہے گویا جبر و قدر کا مسئلہ حل کر دیا ہے ؎

جو ہو سکتا ہے اس سے وہ کسی سے ہو نہیں سکتا
مگر دیکھو تو پھر کچھ آدمی سے ہو نہیں سکتا

فنافی الذات و فی الصفات کی کیفیت دیدنی ہے۔ کہتے ہیں ؎

زہے تلاش کہ سرگرم جستجو ہو کر
ملا ہوں رنگ میں رنگ اور بو میں بو ہو کر

عیش و غم کا توام ہونا کس خوبی سے بیان کیا ہے ؎

فلک دیتا ہے جن کو عیش اُن کو غم بھی ہوتے ہیں
جہاں بجتے ہیں نقارے وہاں ماتم بھی ہوتے ہیں

صلح کُل زندگی بسر کرنے کی ہدایت اس طرح کی ہے ؎

دشمنوں سے دوستی غیروں سے یاری چاہئے
خاک کے پُتلے بنے تو خاکساری چاہئے

اس اشعار کا رنگ ملاحظہ ہو۔ یہ غزل کی غزل مرقع ہے اور ایک ایک شعر معنوی خوبیوں کا مجموعہ بنا ہوا ہے ؎

سبق ایسا پڑھا دیا تو نے   دل سے سب کچھ بھلا دیا تو نے

ہم نکمے ہوئے زمانے کے   کام ایسا سکھا دیا تو نے

لاکھ دینے کا ایک دینا ہے   دلِ بے مدعا دیا تو نے

کیا بتاؤں کہ کیا لیا میں نے   کیا کہوں میں کہ کیا دیا تو نے

بے طلب جو ملا - ملا مجھ کو   بے غرض جو دیا - دیا تو نے

جس قدر میں نے تجھ سے خواہش کی   اُس سے مجھ کو سوا دیا تو نے

مٹ گئے دل سے نقشِ باطل سب   نقشہ اپنا جما دیا تو نے

مجھ گنہ گار کو جو بخش دیا   تو جہنم کو کیا دیا تو نے

داغ کون دینے والا تھا
جو دیا اے خدا دیا تو نے

اسی طرح یہ شعر کس قدر کیفیت انگیز ہیں ؎

کشتۂ یاس ہوں مقتولِ تمنا ہوں میں   اور اس زندگیِ عیش پہ مرتا ہوں میں

کچھ خبر ہی نہیں اللہ ری میری بے خبری   کس کا مشتاق ہوں میں کون ہوں میں کیا ہوں میں

خاک میں مل جائے دل گر مدعا پیدا کروں   جب مٹاؤں ایک کو تو دوسرا پیدا کروں

آفرینش سے میری کچھ اور تو مطلب نہ تھا   مدعا یہ تھا کہ پیدا کرکے ناپیدا کروں

عدم سے دیکھنے رنگِ ظہور ہم آئے   ملا نہ جس کے لئے اتنی دور ہم آئے

مدینہ چھوڑ کے پھر رام پور ہم آئے   یہ کس بلا میں دلِ ناصبور ہم آئے

یہ خوفِ اہلِ وطن تھا کہ دشتِ غربت میں　　　وطن سے بچتے ہوئے دور دور ہم آئے

طرزِ قدسی میں کبھی شیوۂ انساں میں کبھی　　　ہم بھی اک تجھ تھے اس عالمِ امکاں میں کبھی
رنج میں رنج کا راحت میں راحت کا شریک　　　خاک ساحل میں کبھی موج ہوں طوفاں میں کبھی

دامن پہ ترے لگی ہے خاک　　　اتنا ہی مرا نشاں بہت ہے
کونین کے لطف کس سے اُٹھیں　　　مجھ کو غمِ دو جہاں بہت ہے

ناظرین اندازہ کریں گے کہ پاکیزگیٔ جزئیات اور حُسنِ تخیل کی یہ مثالیں کیسی کچھ دل فریب ہیں۔ سب سے بڑی صفت یہ ہے کہ دقیق سے دقیق مسائل بیان کئے ہیں لیکن زبان کی سادگی جو داغ کا خاص انداز ہے ہاتھ سے جانے نہیں پائی۔ متقدمین اور متاخرین میں سے بھی اکثر نے انہیں مضامین کو باندھا ہے لیکن اُن کا اسلوب بیان اس قدر صاف وشستہ نہیں بلکہ مغلق الفاظ اور پیچیدہ عبارت سے مطالب اکثر عسیر الفہم ہو گئے ہیں۔ داغ کی یہ امتیازی خصوصیت ہے کہ وہ مشکل مضمون کو آسان سی آسان زبان میں ادا کر دیتے ہیں اور غزل میں اس قسم کی صاف وشستہ بندشوں کی مثالیں وافر تعداد میں موجود ہیں۔

داغ کی زبان کی بابت لکھنا تحصیل حاصل ہوگا۔ مضامین کے اعتبار سے خواہ کوئی شخص اُن کے مذاقِ سخن کو ادنیٰ درجے کا سمجھے لیکن اُن کے معترضین کو بھی اس کا اعتراف ہے کہ جو سادگی اور صفائی اُردو میں اُنھوں نے پیدا کی ہے وہ اُنہیں کا حصہ ہے۔ فصیح الفاظ، عام فہم ترکیبیں، برجستہ محاورے، سُلجھی ہوئی بندشیں، روزمرہ کی صفائی، ان تمام

4

اعتبار سے اُن کا طرزِ بیان بے نظیر ہے اُن کا ہر ایک دیوان اسالیبِ بیان کی خوبیوں اور زبان کے محاسن سے لبریز ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ اُن کی زبان میں صنّاعی کو مطلق دخل نہیں" اُنھوں نے محاورے اور چٹکلے بجنسہ اُسی طرح نظم کر دیئے ہیں جس طرح روزمرّہ کی گفتگو میں بولے جاتے ہیں۔" لیکن انصاف سے دیکھیے تو اُس کی ضرورت بھی تھی۔ غزلوں کی زبان جس قدر صاف و شستہ اور عام گفتگو کے قریب ہو اُتنا ہی اچھا ہے۔ اسی وجہ سے سوداؔ کے بالمقابل میرؔ کی غزلیں اُصولاً بلند پایہ سمجھی گئی ہیں اور اسی لئے جراتؔ و انشاؔ و مصحفیؔ و ظفرؔ کا کلام جہاں تک اُس کا تعلق غزلیات سے ہے صفائی و شستگی کے اعتبار سے قابلِ تعریف خیال کیا جاتا ہے۔

ہمیں مسٹر چکبست ایسے سخن فہم اور نکتہ شناس کے ان الفاظ پر حد درجہ حیرت ہوتی ہے کہ

> وہ جوہرِ عالی جو شاعرانہ زبان کی جان ہے۔ داغؔ کی زبان میں موجود نہیں یہ وہ جوہر ہے جو ہر زبان میں الفاظ سے صنّاعی پیدا کرنے سے ہوتا ہے۔ صنّاعی سے مراد تصنع نہیں ......

اس میں شک نہیں کہ یہ خیال کسی حد تک صحیح ہے لیکن جہاں تک اس کا تعلق داغؔ کے کلام سے ہے خلافِ واقع ہونے میں کلام نہیں ہو سکتا۔ تجربہ اور مشاہدہ دونوں سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ غزلیات میں خصوصیت کے ساتھ صفائی اور سادگی کی ضرورت ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میرؔ کی غزلیں کبھی سوداؔ کے مقابلہ میں مقبولِ عام نہ ہوتیں۔ ان دونوں اُستادوں کے کلام کا موازنہ جب کبھی اور جس کسی نے کیا، غزل گوئی میں میرؔ کو اور قصیدہ نگاری میں سوداؔ کو ترجیح دی ہے۔ اگر زبان کی صنّاعی کا بار غزلیات اُٹھا سکتیں

تو کبھی یہ شعر ؎

سرہانے میرؔ کے آہستہ بولو — ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

اس شعر کے آگے سرسبز نہ ہو سکتا ؎

سوداؔ کی جو بالیں پہ گیا شورِ قیامت — خدامِ ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے

اصل یہ ہے کہ تغزل کا رنگ کچھ سلاستِ زبان ہی سے زیادہ نکھرتا ہے مثلاً سوداؔ کا ایک شعر ہے ؎

کیفیت چشم اُس کی مجھے یاد ہے سوداؔ — ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

مضمون کے بلیغ اور لطیف ہونے میں شک نہیں۔ لیکن دیکھیے یہی مضمون میرؔ کس انداز سے ادا کرتے ہیں ؎

یاد آئی کسی کی چال ہمیں — ہمنشیں ہم چلے سنبھال ہمیں

دونوں شعر بجائے خود قابلِ تعریف ہیں لیکن پہلے میں شکوہ الفاظ سے کام لیا گیا اور دوسرے میں ایک خاص حالت کا اظہار سادہ الفاظ میں اس طرح کیا گیا ہے کہ سننے والوں کے قلوب متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ یہی حال غالبؔ کی اُن غزلوں کا ہے جو صاف اور سادہ زبان کی بہترین مثال قرار پا سکتے ہیں۔ اُن کے یہ اشعار ؎

کوئی اُمید بر نہیں آتی — کوئی صورت نظر نہیں آتی

موت کا ایک دن مقرر ہے — نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی — اب کسی بات پر نہیں آتی

سامع کے دل و دماغ کو جن کی کیفیات سے لبریز کرتے ہیں اور مندرجہ ذیل اشعار سے پیدا ہونا ناممکن ہے ؎

ہوئی ہے مانعِ ذوقِ تماشہ خانہ ویرانی — کفِ سیلاب باقی ہے برنگِ پنبہ روزن میں

نکوہش مانعِ بے ربطی شورِ جنوں آئی — ہوا ہے خندۂ احباب بخیہ جیب و دامن میں

مسٹر چکبست آتش لکھنوی کے ان اشعار کو صناعی کی دلپذیر مثال کے طور پر پیش کرتے ہیں ؎

وہی نشو و نمائے سبزہ ہے گورِ غریباں پر — ہوائے چرخ نگاری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

تراشا تجھ کو جس بُت ساز نے اے بُت قیامت کی — بنایا شیشہ سے نازک مزاج سنگِ خارا کو

چمن میں جاک بھولے سے میں خستہ دل کرا ہا تھا — کیا کی گل سے بلبل حیلۂ دردِ گلو برسوں

لیکن ہمیں ان کے ساتھ متفق نہ ہونے کا افسوس ہے۔ اگر یہی صناعی ہے تو تصنع اور مبالغہ کس چیز کا نام ہے؟ حق تو یہ ہے کہ صناعی بجائے خود تصنع کا پہلا زینہ ہے اور اس سے شاعر کا عجز ظاہر ہوتا ہے۔ گویا جب اُسے ایسا مضمون نہیں ملتا جو جدّت رکھتا ہو تو وہ معمولی ہی مضمون کو خوبصورت الفاظ سے زینت دیتا ہے تاکہ عام نگاہیں لفظوں میں محو ہو کر معانی و مطالب پر نہ پڑ سکیں۔ اس کے علاوہ اکثر شعراء کی طبیعتیں کچھ ایسی دقت پسند ہوتی ہیں کہ وہ ایک سیدھے مضمون کو بھی پیچیدہ طریقہ پر باندھتے ہیں۔ غالب کے اُردو دیوان کا ایک حصہ اسی قبیل کا ہے اور مومن بھی اسی طرزِ خاص کے پیرو تھے لیکن اس قسم کے اشعار کو زبان کی صناعی کا نمونہ کہنا درست نہیں لیکن اگر بہ فرضِ محال مسٹر چکبست کی رائے تھوڑی دیر کے لئے تسلیم بھی کر لی جائے تو بھی صناعی، تصنع، اور بناوٹ میں کوئی تمیز اُن کے مقررہ

معیار کے مطابق بہت مشکل ہے۔ وہ ایک طرف مومنؔ کے اس شعر کو ؎

دشنامِ یار طبعِ حزیں پر گراں نہیں ۔۔۔ اے ہم نشیں نزاکتِ آواز دیکھنا

مرصع زبان کی خوبیوں سے مالامال سمجھتے ہیں اور امیرؔ مرحوم کے اس شعر میں ؎

ہے چرخ پر یہ ایما ابروئے ماہِ نو کا ۔۔۔ کچھ کچھ خمیدگی بھی لازم ہے بانکپن میں

انہیں خمیدگی کا لفظ ثقیل اور مغلق معلوم ہوتا ہے۔ بہرکیف ہم اس افراط و تفریط دونوں کے خلاف ہیں اور ہماری ذاتی رائے یہ ہے کہ غزلیات میں زبان کا رنگ وہی پسندیدہ ہو سکتا ہے جو میرؔ، جراتؔ، اور سب سے آخر داغؔ اختیار کر چکے ہیں اور جو خاص و عام سے قبولیت اور رہردلعزیزی کی سند پا چکا ہے۔

زبان کی طرح داغؔ نے حسبِ ضرورت تشبیہات و استعارات سے جہاں کام لیا ہے میانہ روی کو مدِنظر رکھا ہے اور شاعر کو اس بارے میں عموماً نہایت احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے کیوں کہ جب طبیعت کو اس کا چٹخارہ پڑ جاتا ہے تو صلاحیت جاتی رہتی ہے۔ اور اُسے صرف الفاظ ہی الفاظ کا طلسم تیار کرنے کی فکر لگی رہتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تشبیہات اور استعارے زبان کا زیور ہیں لیکن زیور بھی جب حد سے بڑھ جاتے ہیں تو بدنما معلوم ہوتے ہیں۔ خاتونانِ فرنگ بھی زیورات کا استعمال کرتی ہیں اور ہندوستان کی عورتیں بھی جو سیروں سونے چاندی کا بوجھ اُٹھائے پھرتی ہیں اور اپنی مزدورانہ حالت پر خوش ہیں، یہ صرف ناواقفی اور تنگ خیالی کا سبب ہے۔ یہی حال زبان اور صنائع و بدائع کا ہے۔ بعض اسی میں کمال پیدا کرنے کو منتہائے شاعری سمجھتے ہیں لیکن جو لوگ زبان کے اُصول و فروع سے آگاہی رکھتے ہیں اُنہیں معلوم ہے کہ زبان کا حُسن تصنّع سے جاتا رہتا ہے۔

داغ کے متعلق یہ اعتراض کئے جاتے ہیں کہ وہ پیش پا افتادہ تشبیہات و تلمیحات کے عادی تھے۔ لیکن انصاف پسند نظروں میں یہ صحیح نہیں سمجھے جا سکتے۔ داغ کی صاف اور فصیح زبان بعید از خیال استعاروں اور بعید القیاس تشبیہوں کی کبھی متحمل نہ ہو سکتی تھی۔ اُس کے لئے وہی استعارے اور تشبیہیں موزوں کہی جا سکتی ہیں جن کا ادراک سامع کی طبیعت پر بجائے کاوش پیدا کرنے کے شگفتگی پیدا کرے۔ داغ کی زبان میں ایک سادہ رُو حسین کی سی کیفیت ہے جس کی ناک میں نیم کا تنکا دل فریبی کی وہ شان رکھتا ہے جو ہزاروں اور زیوروں میں نہیں ہو سکتی۔

اس وقت تک ہم کئی پہلوؤں سے داغ کی شاعری پر بحث کر چکے ہیں، وہ ایک معمولی باتیں اب بھی رہی جاتی ہیں لیکن بہ خوف طوالت ہم اُنہیں نظر انداز کرتے ہیں اور اب داغ کے کلام پر عمومی حیثیت سے ایک اجمالی نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔ اب ہمیں اُن کے اشعار کی کسی خاص نوعیت سے تعلق نہ ہو گا بلکہ ہر صنف کلام پر سرسری تنقید کریں گے۔

یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ داغ اپنے رنگ کے موجد اور مالک تھے۔ اُن کی دیکھا دیکھی اور بھی شاعروں نے اُن کی تقلید کی لیکن نقل میں اصل کا رنگ نہ آ سکا۔ متقدمین میں جرأت کا رنگ داغ سے ملتا ہوا ہے لیکن داغ جس منزل پر پہنچے ہیں۔ جرأت کو وہاں کی ہوا بھی نہیں لگی، اور صفات کے ماسوا سب سے بڑی خصوصیت داغ کے کلام کی یہ ہے کہ اُن کے جذبات و محسوسات بالکل نیچرل ہیں اور اسی وجہ سے تاثیر دست و گریباں ہیں۔ کلام کی شوخی طرز بیان کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے یہ تمام باتیں داغ کے اشعار میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں عشق و محبت

کے رمز و کنائے، محاورے، چٹکلے، روزمرّہ، یہ چیزیں داغ کی خاص ملکیت ہیں۔ یہ خصوصیات اور شعراء کے کلام میں بھی ایک حد تک موجود ہیں لیکن داغ نے ان پر جدّت کا ایسا گہرا رنگ چڑھایا ہے گویا یہ اُنہیں کا خاص ایجاد ہے۔

حشو و زوائد اور تقریباً عیوب شعری سے اُن کا کلام عموماً پاک وصاف ہے اور اُن کا ایک ایک شعر نازک خیالی اور مضمون آفرینی کا نمونہ ہے۔ اُن کے خیالات میں تازگی ہے اور اسلوب بیان اس قدر سُلجھا ہوا ہے کہ بایدو شاید کوئی خیال اور کیسا ہی مضمون کیوں نہ ہو اُسے اس طرح ادا کر دیں گے کہ اُس کی نزاکت اور شگفتگی دوبالا ہو جاوے گی۔

نظر بندی اور مبالغہ اُن کے تخیل کے حدود سے باہر ہیں جو بات کہتے ہیں اس قدر سادہ اور سچّی ہوتی ہے کہ دل پر اثر کرتی ہے۔ علمی دقائق اور فلسفیانہ نکات اُنھوں نے حل نہیں کئے لیکن جو کچھ بھی کہا ہے مؤثر طریقہ پر کہا ہے۔

میر تقی میر کے حال میں مولنا آزاد مرحوم فرماتے ہیں:۔

ان کا صاف اور سُلجھا ہوا کلام اپنی سادگی میں ایک انداز دکھاتا ہے اور فکر کو بجائے کاہش کے لذت بخشتا ہے اسی واسطے خواص میں معزز اور عوام میں ہر دل عزیز ہے۔

یہی کیفیت داغ کی غزلیات کی ہے کہ پڑھنے والا اپنی استعداد اور مذاق کے مطابق اس میں دل چسپی کا سامان پاسکتا ہے۔ اگر ایک شاہد باز اُن کے اس شعر ؎

کسی کی شرم آلودہ نگاہوں میں شوخی ہے

کو پڑھ کر مزا لیتا ہے تو اصحابِ ذوق سلیم ایسے شعر سے لطف اندوز ہوتے ہیں ؎

فلک پروہ بنا اہلِ زمیں کی پردہ داری کو
مگر اس دشمنِ جاں نے کسی کا عیب کب ڈھانکا

یہ غزل اسی طرح میں کہی گئی جسے ناسخ، آتش، غالب، امیر، سب روند چکے ہیں۔ اس قسم کی زمینوں میں پھولنا پھلنا شاعر کے پختہ کار ہونے کی دلیل ہے۔ داغ کے یہ چند اشعار قابل ملاحظہ ہیں ؎

مزہ ہر ایک کو تازہ ملا ہے عشقِ جاناں کا
نگہ کو دید کا لب کو فغاں کا دل کو ارماں کا

یہ کیا ہے آج غیروں سے مری تعریف ہوتی ہے
یہ کیا ہے خود بیاں ہوتا ہے اپنے جورِ پنہاں کا

مریضِ جاں بلب دیکھے ہیں پر ایسے نہیں دیکھے
خدا حافظ نہیں ہوتا ترے بیمارِ ہجراں کا

سرِ محفل مجھی سے تجھ کو ظالم پردہ کرنا تھا
پھر اس پر یہ قیامت غیر کے دامن میں منہ ڈھانکا

اِن اشعار کی کیفیت کچھ اور رہی ہے ؎

سرشکِ تلخ کی تلخی گوارہ ہے تو ہم کو ہے
زمیں پیتی نہیں آنسو ہماری چشمِ گریاں کا

بنا کر اپنا دیوانہ الگ بچ کر نکل جانا
تیرے دامن سے لینا ہے ہمیں بدلہ گریباں کا

وہ چشمِ آبلہ بھی دید کے قابل ہے اے وحشت
نظر میں جس کی پہلے چبھ گیا کانٹا بیاباں کا

غالبؔ کی یہ غزل بہت مشہور ہے ؎

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

اس زمین میں بھی داغ اپنا جداگانہ انداز قایم رکھنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ کہتے ہیں ؎

جوشِ گریہ میں یہ آنکھیں ابرِ نیساں ہو گئیں
اب میری بے تابیاں مشہورِ دوراں ہو گئیں

رازِ الفت چھپ سکا ہم سے نہ اُس کے روبرو
صاف دل کی حسرتیں منہ پر نمایاں ہو گئیں

داغ اب یوسف کہاں لیلیٰ کہاں شیریں کہاں
جو حسیں شکلیں تھیں زیرِ خاک پنہاں ہو گئیں

یہ غزل بھی غالب کی طرح پر کہی گئی ہے ؎

قول تیرا شوق میرا چاہیئے — جھوٹ سچ کے واسطے کیا چاہیئے

اس میں یہ چند شعر بیت الغزل ہیں ؎

اے فلک سامانِ محشر ہی سہی — اپنی آنکھوں کو تماشہ چاہیئے
گو تری نظروں سے کل گر ہی پڑے ہیں — آج تو کوئی سہارا چاہیئے
تیرے جلوے کا تو کیا کہنا مگر — دیکھنے والے کو دیکھا چاہیئے

اسی طرح میں ایک اور مختصر سی غزل زمانۂ اخیر کی یادگار ہے ۔ دیکھئے مطلع کی کیا شان ہے ؎

سب متاعِ دین و دنیا چاہیئے — اے ہوس تجھ کو بھی کیا کیا چاہیئے
اُڑ گیا بادِ خزاں سے آشیاں — مجھ کو تنکے کا سہارا چاہیئے
اب تو دیکھی ہے بُری حالت میری — پھر بھی دیکھیں گے وہ دیکھا چاہیئے

آتش کی غزل ہے ؎

یہ بزم وہ ہے کہ لاخیر کا مقام نہیں — ہمارے گنجفے میں بازیِ غلام نہیں

اس پر ناسخ نے بھی خوب کہا ہے ۔ مگر داغ کی طرز سب سے نرالی ہے کہتے ہیں ؎

کبھی فلک کو پڑا دل جلوں سے کام نہیں — اگر نہ آگ لگا دوں تو داغ نام نہیں
وہ کاش وصل کے انکار ہی پہ قائم ہوں — مگر انہیں تو کسی بات پر قیام نہیں

الٰہی تو نے حسینوں کو کیوں کیا پیدا   کچھ اُن کی ذات سے دنیا کا انتظام نہیں
پیوں پلاؤں تجھے دور ہی سے ترسا دوں   یہ روزِ عید ہے زاہد مہِ صیام نہیں

داغ کا یہ رنگ وہی ہے جو عام پسند کہلاتا ہے لیکن جیسا ہم اوپر لکھ آئے ہیں صرف یہی انداز اُن کی شہرت کا ضامن نہیں۔ اکثر مقامات پر اُن کا طرزِ کلام آزادانہ ہوتا ہے لیکن نازک خیالی کا سررشتہ ہاتھ سے نہیں جانے پاتا۔ مثلاً کہتے ہیں ؎

کیا کہا پھر تو کہو دل کی خبر کچھ بھی نہیں   کیوں یہ کیا ہے خمِ گیسو میں اگر کچھ بھی نہیں
آنکھ پڑتی ہے کہیں پاؤں کہیں پڑتا ہے   سب کی ہے تم کو خبر اپنی خبر کچھ بھی نہیں
لامکاں میں بھی تو کچھ جلوہ نظر آتا ہے   بے کسی میں تو اُدھر ہوں جدھر کچھ بھی نہیں

ہم نے اب تک اساتذہ کے کلام سے صریحی موازنہ کرنے سے عمداً اجتناب کیا ہے لیکن اس کی دو ایک مثالیں پیش کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس سے کسی شاعر کا نقص کمال ظاہر کرنا مقصود نہیں بلکہ صرف یہ دکھانا ہے کہ اور شعراء کے ساتھ داغ کی کیا حالت ہے اور اُن کے تخیلات میں کون امتیازی فرق نمایاں ہے۔

آتش ؎   سمجھتے ہیں میرے دل کی، وہ کیا نافہم و ناداں ہیں
حضورِ شمع بے مطلب نہیں پروانہ آتا ہے

امیر ؎   ہما یوں اُستخوانِ سوختہ پر میرے گرتا ہے
تڑپ کر شمع پر جیسے کوئی پروانہ آتا ہے

داغ ؎   تڑپتا لوٹتا اُڑتا جو بے تابانہ آتا ہے
یہ مرغِ نامہ بر آتا ہے یا پروانہ آتا ہے

داغ نے پروانہ کا قافیہ ایک اور باندھا ہے اور نازک خیالی و جدت طرازی کی ایسی مثال پیش کی ہے جس کی نظیر نہیں مل سکتی ہے ؎

رخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

میر ؎ برقع کو اُٹھا چہرہ سے وہ بُت اگر آئے
اللہ کی قدرت کا تماشا نظر آئے

سودا ؎ اس دل کی تف آہ سے کب شعلہ بر آئے
بجلی کو دمِ سرد سے جس کے حذر آئے

داغ ؎ جب اُس کے مقابل میرے داغِ جگر آئے
خورشیدِ قیامت کو بھی تارے نظر آئے

نظر کا قافیہ داغ نے ایک اور بھی بہت اچھا باندھا ہے ؎

حسن آئینۂ عشق ہو عشق آئینۂ حسن
میں تجھ کو نظر آؤں مجھے تو نظر آئے

امیر و داغ کا جھگڑا ایک مدت تک رہ چکا ہے۔ ہم اُس پر تیل ڈالنا نہیں چاہتے جو اِن دونوں باکمالوں کی موت سے سرد ہو چلی ہے۔ قصداً ان دونوں کے ہم قافیہ و ہم ردیف اشعار لکھے نہیں گئے۔ لیکن اگر ان کا امتیازی رنگ دریافت کرنے کی ضرورت ادبی دلچسپی کے اعتبار سے مسلّم ہو تو ہم صرف ان دونوں اُستادوں کا ایک ایک شعر لکھنے پر اکتفا کریں گے جس سے اندازہ ہوگا کہ ایک ہی پیرائے میں دونوں اپنی اپنی جگہ کس طرز پر ادا کرتے ہیں ؎

امیرؔ ؎

کبھی سمجھا نہ آگے کیا ہم اُس خودسر کو سمجھاتے
سمجھ جاتا اگر اتنا کسی پتھّر کو سمجھاتے

داغؔ ؎

نہ سمجھا عمر گذری اُس بُتِ کافر کو سمجھاتے
پگھل کر موم ہو جاتا اگر پتھّر کو سمجھاتے

مندرجۂ بالا سطور سے ناظرین اندازہ کریں گے کہ داغؔ کی طبیعت کس قدر مستقیم اور اُن کا رنگ کتنا پختہ ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ اُن کا شعر سُن کر بے اختیار اندازِ بیان اور لطفِ خیال کا احساس ہو جاتا ہے یہ صفت صرف اُس شخص کے کلام میں پائی جاتی ہے جو "بدوِ فطرت سے ایک خداداد طبیعت لے کر آیا ہو"۔ داغؔ کا کلام ہندوستان کے ہر طبقہ میں اس قدر ہر دل عزیز ہے کہ اُس کا نمونہ پیش کرنے کی کچھ زیادہ ضرورت نہیں۔ اُن کی غزلیات کا ایک حصّہ اوپر گذر چکا ہے اور جستہ اشعار یہاں درج کئے جاتے ہیں جن سے ان کی زبان اور بیان کے ساتھ قوتِ متخیلہ کی سحرکاریوں کا اندازہ ہو جائے گا۔ طوالت کا خیال نہ ہوتا تو اس بارے میں کسی قدر تفصیل سے کام لیا جاتا ؎

خاطر سے یا لحاظ سے میں مان تو گیا — جھوٹی قسم سے آپ کا ایمان تو گیا
دیکھا ہے بُت کدہ میں جو اے شیخ کچھ نہ پوچھ — ایمان کی تو یہ ہے کہ ایمان تو گیا

شکر کرتا ہوں کہ شکوہ نہیں لب پر آیا — دیکھ تو کون ہے اے داورِ محشر آیا

ان شوخ حسینوں پہ جو مائل نہیں ہوتا — کچھ اور بلا ہوتی ہے وہ دل نہیں ہوتا

دل کا کوئی حامی دمِ بسمل نہیں ہوتا — کمبخت کلیجہ بھی تو شامل نہیں ہوتا

اس قدر ناز ہے کیوں آپ کو یکتائی کا — دوسرا نام ہے یہ بھی مِری تنہائی کا

میرے ہی واسطے بیٹھا ہے پاسباں دَر پر — ملے جو راہ میں کہتے ہیں آیئے گھر پر

نالے کرنے دلِ ناکام بُرے ہوتے ہیں — کہ بُرے کاموں کے انجام بُرے ہوتے ہیں
ذبح کیجئے نہ مجھے میں تو یوں ہی مرتا ہوں — آپ کیوں لے کے یہ الزام بُرے ہوتے ہیں

باغ میں گل کھلے جاتے ہیں کہ وہ آتے ہیں — اُنگلیاں سرو اُٹھاتے ہیں کہ وہ آتے ہیں
نہیں منظور جو بچنا تو دمِ چارہ گری — ہم مسیحا کو ڈراتے ہیں کہ وہ آتے ہیں

چاک ہو پردۂ وحشت مجھے منظور نہیں — ورنہ یہ ہاتھ گریباں سے تو کچھ دور نہیں
رات دن نامہ و پیغام کہاں تک ہوں گے — صاف کہہ دیجئے ملنا ہمیں منظور نہیں

پوشیدہ جب راز کہ مُنہ میں زباں نہ ہو — ہم بات بھی کریں تو بغیر از فغاں نہ ہو

تیرے پہلو سے وہ اُٹھے غیر کی تعظیم کو — بندگی کو بندگی تسلیم ہے تسلیم کو

جہاں ہوں جس جگہ ہوں ہم دمِ اصحاب کامل ہوں
نظر آنکھوں میں ہوں مُنہ میں زباں ہوں سینے میں دل ہوں

خدا نے خیر کردی بچ گئی دربان سے عزت
یہی کہنا پڑا کچھ مانگنے آیا ہوں سائل ہوں

اک ادا مستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی
اُف تری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی

میرا یہ دعویٰ سوا تیرے کوئی دل میں نہیں
اُس کا یہ الزام اچھی قیدِ تنہائی ہوئی

کچھ بھی اُلفت نے تیری دل میں نہ چھوڑا باقی
رہ گئی ایک تمنا ہی تمنا باقی

میرے یاد کرنے سے یہ مدعا تھا
نکل جائے دم ہچکیاں آتے آتے

موجود ہر جگہ ہے نشاں بے نشاں کہیں
وہ ہر کہیں ہے ڈھونڈھے اُس کو جہاں کہیں

میں غیر کی نگاہ میں تم میرے دل میں ہو
میرا مکاں کہیں ہے تمہارا مکاں کہیں

طور بے طور ہوتے جاتے ہیں
وہ تو کچھ اور ہوئے جاتے ہیں

اب تو بیمارِ محبت تیرے
قابلِ غور ہوئے جاتے ہیں

کچھ خبر بھی ہے محبت میں داغ
کیا ترے طور ہوئے جاتے ہیں

فرشتے کو پکڑ رکھیں تیرے دربان ایسے ہیں
خدا سے بھی نہیں ڈرتے یہ بے ایمان ایسے ہیں

اگر تو بھی نکالے گا نہ نکلیں گے نہ نکلیں گے
میرے ارمان اتنے ہیں میرے ارمان ایسے ہیں

رقیبوں کو محبت کا ہے دعویٰ اے تیری قدرت ——— یقیں ہے تم کو لو وہ بھی خدا کی شان ایسے ہیں
یہ سر کے ساتھ جائیں گے یہ دم کے ساتھ جائیں گے ——— ہمارے سر پہ آصف جاہ کے احسان ایسے ہیں

رگِ جاں سے نزدیک ہے میری جاں تو ——— مگر پھر جو دیکھا کہاں ہیں کہاں تو
حقیقت میں ہے ماسوا چیز ہی کیا ——— اِدھر تو اُدھر تو یہاں تو وہاں تو

حیا و شرم سے کب وہ چُپ چاپ آ کے چلے ——— اگر چلے تو مجھے سیدھیاں سُنا کے چلے
خبر نہیں کہ کوئی تاک میں بھی بیٹھا ہے ——— یہ جھُٹ پٹے میں کہاں آپ مُنہ چھپا کے چلے

جو دکھانے کی نہ ہوں چیزیں دکھائیں کس طرح ——— اُس نے چہرے ہی کی کھنچوائی فقط تصویر ہے

ہمیں کیا غم قیامت میں جو پرسش ہونے والی ہے ——— کہ جب وہ فتنہ گر آیا تو پھر میدان خالی ہے
کدورت دل سے جو فریاد کرنے میں نکالی ہے ——— وہ کہتے ہیں محبت پر ہماری خاک ڈالی ہے
ہوا ہے چار سجدوں پر یہ دعویٰ زاہدو تم کو ——— خدا نے کیا تمہارے ہاتھ جنت بیچ ڈالی ہے
بچا تھا برق و صرصر سے یہ مشکل آشیاں اپنا ——— نظر صیاد کی اب پتے پتے ڈالی ڈالی ہے

تاک کر دل کو وہ فرماتے ہیں مال اچھا ہے ——— یہ خدا کی قسم اندازِ سوال اچھا ہے
یہ تیری چشمِ فسوں گر میں کمال اچھا ہے ——— ایک کا حال برا ایک کا حال اچھا ہے
وہ عیادت کو میری آئے ہیں لو اور سُنو ——— آج ہی خوبیِ تقدیر سے حال اچھا ہے

آپ پچھتائیں نہیں جور سے توبہ نہ کریں
آپ گھبرائیں نہیں داؔغ کا حال اچھا ہے

داؔغ ایک فطرتی شاعر تھے اور اُن کا رنگ خدا داد تھا۔ ان کی غزل، قصیدہ، رباعی، قطعے، سب ایک ہی شانِ تخیل کے مظہر ہیں۔ قصیدہ کی بابت ہمیں کچھ زیادہ لکھنا نہیں کیوں کہ ہماری عاجز رائے میں میرؔ کی طرح اُن کی شہرت کمال کا ذریعہ اُن کی غزلیں ہیں اور میدانِ تغزل ہی ان کا مارا ہوا ہے۔ قصیدے اُنھوں نے متعدد لکھے اور اُن میں سے اکثر ایسے ہیں جو قصیدہ نگاری کے معیار پر بھی پورے اُترتے ہیں لیکن حق یہ ہے کہ اس صنف خاص میں ان کے ہم عصر منشی امیر احمد مرحوم امیرؔ مینائی اُن سے کئی منزل آگے ہیں۔ بیشک قصیدوں میں داؔغ کی خصوصیات کلا باحسن الوجوہ موجود ہیں اور تشبیب و تمہید و مدح کی دشوار گزار گھاٹیاں اُنھوں نے بہت خوبی سے طے کی ہیں۔ اُن کا اندازِ بیان اور تاثیرِ کلام غزلوں کی طرح قصائد میں بھی نمایاں طور پر موجود ہے۔ مثلاً تمہید کا یہ مطلع ؎

کہاں وہ عقدۂ لاحل کہاں وہ سخت دشواری — ہوئی پابند آزادی سے اب میری گرفتاری

مدحیہ اشعار ؎

تیرے ابرِ کرم نے کی جو عالم میں گہر باری — تو آب گوہر خوش آب سے دریا ہوا جاری
تیری بزمِ طرب انگیز و عشرت خیز ایسی ہے — تمنا جس کی کرتے ہیں پری رویان فرخاری
یہ وہ درگاہ والا جاہ ہے جس کی سلامی میں — حجازی و عراقی رومی و چینی و تاتاری
سخن فہم و سخن گستر سخن دان و سخن پرور — تجھی سے حسن کو رونق تجھی سے حسن تتاری

اس بات کے شاہد ہیں کہ غزل کا رنگ قصیدہ میں بھی قائم رکھا ہے۔ گھوڑے کی

تیز روی کی تعریف کرتے ہیں تو عاشق کی آہِ رسا سے تشبیہ دیتے ہیں ؎

تیرے اسپِ پری پیکر کی چالاکی کا کیا کہنا ‏ ‏ ‏ ‏ نہیں آتی تصور میں بھی جس کی تیز رفتاری
وہ پہنچے اس طرح اک جست میں مشرق سے مغرب تک ‏ ‏ ‏ ‏ کہ جیسے آہِ عاشق ہو رسا تا چرخِ زنگاری

غرض ہماری رائے ناقص میں داغ کے قصائد بجائے خود اصولی اور قابلِ تعریف ہیں۔ ہاں شکوہِ الفاظ اور شوکتِ مضمون کا طلسم انھوں نے نہیں تیار کیا اور اِسی لئے معیارِ مقررہ کے مطابق سودا، انشا، اور ذوق کے قصیدوں سے اُن کا مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ امیر مینائی بھی اس معرکہ میں اُن سے سربرآ ہو گئے ہیں۔ لیکن ان اساتذہ سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو داغ اس فن میں بھی بیسیوں سے اچھے ہیں۔ یہ بات اور ہے کہ جو کیفیت اُن کی غزلوں کی ہے وہ شان قصیدوں کی نہیں۔

رباعیات بھی داغ نے اپنے رنگ میں خوب کہی ہیں۔ ہم مثالاً چند رباعیاں نقل کرتے ہیں ؎

بے گانہ یہاں ہر ایک یگانہ دیکھا ‏ ‏ ‏ ‏ اپنے مطلب کا سب زمانہ دیکھا
جس کو دیکھا غرض۔ غرض کا اپنی ‏ ‏ ‏ ‏ دنیا کا عجیب کارخانہ دیکھا

بے فائدہ انسان کا گھبرانا ہے ‏ ‏ ‏ ‏ ہر طرح اُسے رزق تو پہنچانا ہے
قارون کے خزانے سے بھی مل جائے گا ‏ ‏ ‏ ‏ منظور جو اللہ کو دلوانا ہے

کہتے تھے نہ عشقِ بتِ خود کام کرو ‏ ‏ ‏ ‏ پہلے ہی سے اندیشۂ انجام کرو
بے تابیِ دل کی ہے شکایت ناحق ‏ ‏ ‏ ‏ اے داغ بس اب قبر میں آرام کرو

کیا جانے کوئی زاہدوں کی گھاتوں کو　　تمیز ذرا چاہئے ان باتوں کو
دن کیوں بڑھے رات کیوں کر کم ہو　　روزوں کے عوض کھاتے ہیں راتوں کو

اخلاقی مضامین کے عوض زیادہ تر عشقیہ باتوں کی کھپت رباعیوں میں کی گئی ہے۔ اگر شقِ اوّل کی طرف توجہ کرتے تو عملی طور پر ان سے وہی فائدہ مترتب ہوتا جو رباعیاتِ حالی سے ہوتا ہے اور یقیناً اُردو زبان میں یہ ایک قابلِ قدر اضافہ ہوتا۔

داغ کی زندگی میں اُن کے تین دیوان شائع ہو چکے تھے گلزارِ داغ، آفتابِ داغ، مہتابِ داغ، پہلا اُن کے اوّلین کلام کا مجموعہ ہے اور یہ اُس وقت شائع ہوا ہے جب وہ رام پور میں تھے۔ آفتابِ داغ میں غزلیں کچھ رام پور کے زمانہ کی ہیں کچھ اُس کے بعد کی۔ مہتابِ داغ حیدرآباد سے نکلا۔ اُن کی وفات کے بعد غیر مطبوعہ کلام کا ایک اور مجموعہ یادگارِ داغ کے نام سے اور چھاپا گیا ہے جس کا ضمیمہ حال میں لالہ سری رام صاحب ایم۔ اے دہلوی نے نکالا ہے۔ اس میں وہ غزلیں اور متفرق اشعار ہیں جو اوپر کے چاروں دیوان میں چھپنے سے رہ گئی تھیں۔ غرض کہ داغ کی ساری زندگی کی یہی کمائی ہے اور اس میں شک نہیں کہ یہ اولادِ معنوی قیامت تک اُن کا نام قائم رکھنے کی پوری صلاحیت رکھتی ہیں۔ ان چیزوں کے علاوہ ایک مختصر مثنوی "فریادِ داغ" کے نام سے نظم کی ہے اس میں اُنھوں نے اپنی ایک سرگذشت قلم بند کی ہے۔ اصل واقعہ کی مختلف النوع تصویروں کے حسن و قبح پر غور کرنا فرائضِ تنقید کی حدود سے باہر ہے، دیکھنا صرف یہ ہے کہ اُصولاً فریادِ داغ کس پایہ کی ہے۔

تمام کتاب پر جو ۵۲ صفحوں پر ختم ہوئی ہے سرسری نگاہ ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ علمی نقطۂ خیال سے وہ بدرِ منیر وغیرہ کے پہلو میں جگہ نہیں پا سکتی نہ اُس سے کسی خاص

وقت کی سوسائٹی کی کیفیت ظاہر ہوتی ہے نہ کوئی دل کش منظر ایسا ہے جو نیچرل کہا جاسکے۔ معنوی اعتبار سے بھی مثنوی کچھ نتیجہ خیز نہیں۔ البتہ چند امور قابل توجہ ہوسکتے ہیں وہ یہ ہیں کہ واقعات کے ثبوت میں کسی مافوق العادت قوت سے کام نہیں لیا گیا۔ زبان نہایت سلیس اور فصیح ہے۔ بیان کا تسلسل قابلِ تعریف ہے۔ فارسی ترکیبوں اور ثقیل الفاظ مطلق نہیں بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی سے بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔

مثلاً نواب رام پور کی مدح میں یہ اشعار کس قدر سادہ اور افصح ہیں ؎

مدحِ نوابِ نامدار کروں — جان قربان دل نثار کروں
حاجی و زائر و خدا آگاہ — شاہ درویش خوئے ظل اللہ

وہ دلاور رئیس اخترِ ہند — وہ مخاطب مشیرِ قیصرِ ہند
اس سخی کا ہے کام دینے کا — اس کے دینے سے نام دینے کا
کیا خزانہ بھرا پُرا پایا — دل خزانہ سے بھی بڑا پایا
سَو مزے ایک بات میں دیکھے — سَو ہنر ایک ذات میں دیکھے
مسند آرائے رام پور رہیں — تاقیامت میرے حضور رہیں
ہے عجب شہر مصطفےٰ آباد — اس کو رکھنا میرے خدا آباد
سب اسے رام پور کہتے ہیں — ہم تو آرام پور کہتے ہیں

خیر نواب کی مناتے ہیں
جس کا کھاتے ہیں اس کا گاتے ہیں

اس طرح کلکتہ سے واپسی کا تذکرہ قابلِ دید ہے ؎

میری رخصت کے دن تمام ہوئے — عیش و عشرت کے دن تمام ہوئے

جلد حاضر ہو یہ پیام آیا | اور سر پر مہِ صیام آیا
پھر تو میں ایک دم ٹھہر نہ سکا | دل کی صورت قدم ٹھہر نہ سکا
اس طرح کس طرح ٹھہر جاتے | ہوئے باون برس نمک کھاتے
گر نمک خوار حیلہ گر نکلے | تو نمک پھوٹ پھوٹ کر نکلے

واپسی کے بعد اندوہِ فرقت کی کیفیت کسی قدر سادہ مگر مؤثر پیرائے میں دکھائی ہے ؎

مرضِ غم سے کب افاقہ تھا | دن کو روزہ شب کو فاقہ تھا
سحری اک زمانہ کھاتا تھا | رمضان مجھ کو کھائے جاتا تھا
صدمۂ ہجر و کاوشِ غم سے | عید بدتر ہوئی محرم سے
شادیانے کا شور بیہم ہے | میں سمجھتا ہوں میرا ماتم ہے
کھانے پینے سے مجھ کو نفرت ہے | عید کو روزہ کیا قیامت ہے
ہائے جب زہر بھی نہ پائیں ہم | کیا کلیجہ بڑوں کا کھائیں ہم

غرض فریادِ داغ میں سلاستِ زبان اور روانیِ کلام کی وہی حدیں کھینچی ہوئی ہیں جو داغ کی مابہ الامتیاز خصوصیت ہے۔ اس کے باوجود کہنا پڑتا ہے کہ غالباً داغ نے بھی اسے پبلک کے لئے مرتب نہیں کیا بلکہ ایک ذاتی سرگذشت کو نظم کا جامہ پہنانے سے یہ مقصود رہا ہوگا کہ دل کا بخار نکل جائے۔

اس مضمون کے آخر میں داغ کے ملکۂ تاریخ گوئی کا سرسری تذکرہ ضروری معلوم ہے اور یہ ہر شاعر کے لئے لابدی نہیں کہ وہ تاریخ گو بھی ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ داغ کو اس میں بھی وہی کمال حاصل ہے۔ ناسخ و ذوق وغیرہ کے اکثر تاریخی

مادّے جو خاص مواقع پر فی البدیہہ کہے گئے بہت مشہور رہیں۔ مہتاب داغ میں، داغ کے متعدد تاریخی قطعات درج ہیں اُن پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں اُنہیں مہ تامہ حاصل تھی۔ سب سے بڑی خوبی اُن کے تاریخی جملوں میں یہ ہے کہ اُن سے اُن سے اُس کا واقعہ کا لفظاً اظہار ہوتا ہے جس سے وہ متعلق ہوتے ہیں مثلاً حضور نظام کی بارگاہ میں رسائی حاصل کرنے اور باریابی پانے کی تاریخ کہی تھی۔

یہ کہہ دو ملے داغ سلطان سے

۱۳۰۵ھ

ایسے ہی جب اُن کے آقائے ولی نعمت نے اُنہیں ایک گھڑی انعام میں دی تو اُس کی تاریخ کہی۔

مرصّع منوّر گھڑی شاہ نے دی

۱۳۱۱ھ

سونے کا توڑا ملا تو اُس کی یہ تاریخ ہوئی۔

یہ سونے کا توڑا عنایت ہوا

۱۳۱۲ھ

حضور غفراں مکان نے تلواریں مرحمت کیں تو یہ تاریخی فقرہ موضوع ہوا۔

لکھ دو اے داغ، عنایت ہوئیں تلواریں آج

۱۳۱۲ھ

"تاریخی مادّوں کے علاوہ دو ایک سہرے بھی داغ کی تصنیف سے بہت اچھے ہیں۔

غرض داغ ایک مکمل شاعر تھے۔ ایسے جامع خصوصیات اہلِ کمال ملک کی عام قدردانی کے حق دار ہیں اور ضرورت ہے کہ ان مشاہیر کی مستقل یادگار قائم کرنے کی صورت پیدا کی جائے۔

سید طاہر علی طاہر فرخ آبادی

داغ کا مرنا قیامت ہو گیا — دل پریشاں ہے مکدر ہے مزاج
نظمِ طاہر نے کہا سالِ وفات — چھپ گیا خورشید لامع ہائے آج

۱۳۲۲ھ

جتنے ہیں اہلِ سخن اہلِ زباں — سب نے مرگِ داغ کے صدمے سہے
مصرعِ تاریخ طاہر نے کہا — شعر گوئی کے مزے جاتے رہے

داغ مرحوم لے گئے ہم راہ — اب کہاں شوکت و تجمّلِ ہند
پائی تاریخ غیب سے طاہر — گلشنِ خلد میں ہیں بلبلِ ہند

۱۳۲۲ھ

محمد سرفراز علی خاں رفعت

آج دنیا سے اٹھ گئے استاد — گلشنِ شاعری ہوا تاراج
سالِ رحلت لکھو یہ سمت میں — آہ گھر گھر ہے ماتمِ داغ آج

۱۹۶۱ بکرمی

پسِ لفظ

مرزا داغ دہلوی نے نواب محبوب علی خاں کی علم دوستی اور ادب پروری کی شہرت سن کر حیدر آباد کا پہلا سفر، ۷ر اپریل ۱۸۸۸ء (۲۴ر رجب ۱۳۰۵ھ) میں کیا تھا اور بازار رشیدی عنبر میں ایک معمولی مکان میں اقامت اختیار کی۔ سوا سال (۷ر اپریل ۱۸۸۸ء تا ۱۲ر جولائی ۱۸۸۹ء) کی سخت جد و جہد کے باوجود دربار نظام میں رسائی کی کوئی کوشش بار آور ثابت نہ ہوئی۔ سخت مایوسی اور سراسیمگی کے عالم میں ۱۲ر جولائی ۱۸۸۹ء کو براہ بنگلور و بمبئی دہلی کی واپسی عمل میں آئی لیکن یہ تاخیر باعثِ راحت ثابت ہوئی اور انہیں استاد السلطان کی حیثیت سے دس ماہ بعد دوسرے سفر کا موقعہ ملا۔ چنانچہ ۲۹ر مارچ ۱۸۸۹ء (۷ر شعبان ۱۳۰۷ھ) کو دہلی سے روانہ ہو کر اپریل ۱۸۸۹ء کے ہفتۂ اول میں حیدر آباد پہونچ کر مولوی ظہور علی اٹاوی کے مکان پر قیام کیا اور وہیں سے مشہور محلہ افضل گنج سے متصل محبوب گنج میں ایک دو منزلہ مکان میں رہائشی سہولت حاصل کی اور ۴ر فروری ۱۸۹۱ء کو پہلی بار دربارِ نظام میں باریابی کا شرف حاصل کیا اور تقریباً ۱۴ سال کے عرصۂ حیات میں انہیں متعدد اعزاز اور شرف قبولیت کی سندیں عطا ہوئیں اور ہیں ۹ر ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ (۱۴ر فروری ۱۹۰۵ء) کو ترپ بازار والی کوٹھی ں بہ حساب قمری ۷۶ سال (اور بہ حساب شمسی ۷۴ سال) کی عمر میں وفات پائی اور

.ıl .ıl 1.02KB/s 4:35 69%

نام پلّی میں حضرت یوسف صاحب شریف کی مزار کے پائیں اپنی زوجۂ عزیز کے برابر مدفون ہوئے۔ ان کی وفات حسرت آیات پر حفیظ جونپوری نے ۳۱ شعروں پر مشتمل جو قطعۂ وفات قلم بند کیا ہے بہت خوب ہے۔ اس قطعہ میں حیدر آباد میں مقیم شعرا، (شاہزادہ مرزا امیر الدین ضیاؔ، منشی ریاض حسن خاں خیالؔ، ڈاکٹر مبارک حسین مبارکؔ، منشی نذیر حسن نسیمؔ دہلوی، سید حسن مرتضیٰ شفق عماد پوری، منشی متین الدین احمد متینؔ مچھلی شہری، وجاہت حسین وجاہتؔ جھنجھانوی، سید ریاض احمد ریاضؔ خیرآبادی، سید محمد عسکری وسیمؔ خیرآبادی، حکیم عبد الکریم خاں برترؔ فتحپوری، ممتاز علی آہؔ، مولوی لطیف احمد اخترؔ مینائی لکھنوی، حافظ جلیل حسن جلیلؔ مانکپوری اور راقم) کے نام نامی بھی شامل ہیں جو حفیظ جونپوری کے ساتھ ہی مرزا داغؔ کی وفات پر سریک گریۂ ماتم ہیں۔ حفیظؔ جونپوری کے علاوہ مولوی محمد عبد الواسع صفاؔ، سید طاہر علی فرخ آبادی، محمد سرفراز علی خاں رفعتؔ، منشی محمد عبد الحمید ناصرؔ بنارسی، ابو المعظم سراج الدین خاں سائلؔ دہلوی اور مولوی عنایت احمد حیرتؔ نے بھی قطعہ کے ذریعہ اپنی محبت و یگانگت کا ثبوت فراہم کیا ہے۔

——— ساحل احمد

مولوی عنایت احمد حیرت

کیا شان کرم ہے دیکھ حیرتؔ بلبل کو خدا نے گھر دیا باغ
دریا کو گہر فلک کو انجم جنت کو نواب میرزا داغؔ

——— ۱۳۲۲ھ

حافظ محمد علی حفیظ جونپوری

مثالِ زلف ہے سنبل یہ کیوں پریشاں حال
لہو یہ آنکھ سے نرگس کے کیوں ٹپکتا ہے

یہ آج کیوں صفِ ماتم بچھائے ہے سبزہ
یہ کس کے سوگ میں پھولوں کا چاک جامہ ہے

یہ کیوں ہے قطرۂ شبنم سرشکِ خون آلود
یہ کیوں نسیمِ سحر آج دل گرفتہ ہے

یہ کیوں ہے بلبلِ رنگیں نوا کو جوشِ فغاں
بجائے نغمہ یہ کیوں آج لب پہ نالا ہے

یہ پھول ہیں کہ ہوا پر بچھے ہیں انگارے
لپٹ یہ نکہتِ گل کی نہیں ہے شعلا ہے

بھڑک اٹھی مرے نالوں سے ور آتشِ گل
لگی ہے آگ چمن میں عجب تماشا ہے

یہاں مراد چمن سے ہے گلشنِ ایجاد
بہارِ ہستیٔ فانی خزاں کا جھونکا ہے

اک ایک بوٹے سے ظاہر اسی کی ہے قدرت
یہ رنگ و بوئے چمن جس کا اک کرشما ہے

خزاں بہار ہے نیرنگِ باغِ عالم کا
گلوں کی تاک میں صرصر نیا شگوفا ہے

اثر سے اس کے نہیں کوئی باغ بھی محفوظ
اسی خزاں نے ہزاروں چمن کو لوٹا ہے

حیات و موت حقیقت میں ایک ہیں دونوں
کلامِ حکم قضا و قدر میں بیجا ہے

ریاضِ دہر کو گلچیں غریب کیا جانے
یہ اُسی سے پوچھیے پودوں کو جس نے سینچا ہے

لیا ہے نالۂ بلبل سے کچھ اسی نے سبق
نگاہِ غور پھولوں کو جس نے دیکھا ہے

غرض ہے بلبلِ رنگیں نوا وہی بلبل
چمن یہ نغمۂ دل کش سے جس کے گونجا ہے

نسیمِ صبح سے نسبت ہے طبعِ موزوں کو
یہ جس کے فیض سے شاداب گل کا تختا ہے

یہ سرو نرگس و سنبل ہیں خوشہ چینِ چمن
کچھ ان کو دیکھنے سننے کا شوق ایسا ہے

کہ صحنِ باغ میں سب رہ گئے بنا کر گھر — حکایتِ گُل و بُلبل اُنہیں کا قصّا ہے
وہ اشکِ چشم ہے شبنم سے جس کی ہے تعبیر — جو پھول سُرخ ہے شاعر کا وہ کلیجا ہے
ہوا ہے برہم و درہم جو کارخانۂ نظم — جہاں سے کوچ کسی مقتدائے فن کا ہے
مچا ہے محفلِ شعر و سخن میں اک کہرام — عروسِ فکر کے ماتم سے حشر برپا ہے
بیاں کیا ہو غم و اضطرابِ اہلِ دکن — یہاں جب ایک سے سنج ایک کو زیادا ہے
ضیا، خیال، مبارک، نسیم ہیں دل تنگ — متین اور وجاہت کو سخت صدما ہے
نڈھال کیوں نہ ہوں تلمیذ یہ خبر سُن کر — رفیق و دوست کو اس حادثہ سے سکتا ہے
ریاض و آہ و جلیل و وسیم و اختر کو — یہ چُپ لگی ہے کہ رونا ہے اب نہ ہنسنا ہے
شفق کو برہم و کوثر کو جاہ و مضطر کو — جو دیکھیے تو قلق شکل سے ہویدا ہے
دلا رہی ہے تری یاد ہر سخن داں کو — ترا جو شعر ہے وہ مرثیہ ہے نوحا ہے
زباں تیری سند مستند کلام ترا — امامِ فن کے لیے اجتہاد زیبا ہے
کہیں ہوئی ہو کوئی سہو تو وہ سہو نہیں — تمام عیب سے کس کا سخن مُبّرا ہے
کہیں گے ہم تجھے مخزنِ زبانِ اُردو کا — جو اعتراض ہے تجھ پر وہ لغو و بیجا ہے
پس فنا ہے یہ معجز بیانیوں کا اثر — کہ تیرا نام ہے زندہ کلام زندا ہے

حفیظ سالِ فنا بے بہا نکال سکے بڑھ
ہیں آج بُلبلِ ہند اور شاخِ طوبیٰ ہے
۱۳۲۲ھ

مولوی محمد عبدالواسع صفاؔ

داغؔ کی ذات سے تھی بزمِ سخن کی رونق
تھا اسی پھول سے گلزار گلستانِ سخن

صرصرِ موت نے آج اس کو کیا پژمردہ
اُڑ گئی بو کی طرح رونقِ بستانِ سخن

ہو گیا خاک میں پنہاں وہ مہِ اوجِ کمال
چھپ گیا درجِ فنا میں دُرِ عمانِ سخن

اب کہاں دلّی میں ایسا ہے کوئی کاملِ فن
جس کے دیوان ہوں مہ و مہرِ درخشانِ سخن

لکھ صفاؔ خامۂ حسرت سے یہ تاریخِ وفات
چھپ گیا زیرِ زمیں وہ مہِ کنعانِ سخن

١٣٢٢ھ

●

منشی محمد عبدالحمید ناصرؔ بنارسی

حیف نوابِ فصیح الملک ناظمِ جنگ داغؔ
زیں سرائے بے بقا شد جانبِ دار السّلام

رونقِ تاجِ فصاحت بود آن والا گہر
نظمِ دل کش داشت از فکرِ بلیغش انتظام

کارِ زیور کرد طبعش با عروسِ شاعری
رو کشِ گل گونہ شد رنگینیٔ طرزِ کلام

اے خوشا بالا نشیں در محفلِ اہلِ ہنر
جدا رونق فروزِ نظم و استادِ نظام

با چنیں اوجِ مناصب داشت خلقِ بے مثال
لطفِ خالق ساخت او را حاجی بیت الحرام

بلبلِ ہند از قفس در گلشنِ فردوس رفت
با شمیمِ فیضِ یزداں تازہ گردیدش مشام

گفت ناصر ہم دعائے خیر و ہم سالِ وفات
در جناں با بلبلِ شیراز باشد لا کلام

۱۳۲۲ھ

ابوالمعظم سراج الدین خاں سائل دہلوی

رفت از دہر چوں فصیح الملک — لرزہ افتاد در تمامیٔ ہند
اوستادِ نظام آصف جاہ — موردِ لطف شاہ حامیٔ ہند
راست برقامتش قبائے سخن — زیب بر روئے خطاب جامیٔ ہند
سلکِ نظمش بسان سلک گہر — جوہریٔ سخن نظامیٔ ہند
شد وفاتش بہ شام یوم الحج — دفن شد روزِ عید سامیٔ ہند

آہ دل برکشید و سائل گفت
مدفنِ پاک داغ نامیٔ ہند

۱۳۲۲ھ